رسل کے مضامین

تالیف و تعارف
ڈاکٹر نعیم احمد

ترجمہ
قاضی جاوید



رسل کے مضامین

تالیف وتعارف

ڈاکٹر نعیم احمد

ترجمہ

قاضی جاوید

مشعل

آر۔بی 5 ' سیکنڈ فلور' عوامی کمپلیکس

عثمان بلاک' نیو گارڈن ٹاؤن' لاہور 54600 ' پاکستان

ترتیب

تعارف

برٹرینڈ رسل کا شمار بیسویں صدی کے عظیم ترین مفکرین میں ہوتا ہے۔ وہ ۱۸۷۲ء میں برطانیہ کے ٹریلک ویلز (Trelleek Wales) کے مقام پر پیدا ہوا۔ رسل کے دادا کا نام لارڈ جان رسل تھا جس نے ۱۸۳۲ء میں مشہور ''ریفارم بل'' پیش کیا تھا اور بعدازاں ملکہ وکٹوریہ کے زمانے میں دوبارہ وزیراعظم منتخب ہوا۔ مشہور فلسفی جان اسٹورٹ مل رسل کے والدین کا دوست تھا۔ رسل کی ذہنی نشوونما میں مل کے افکار و نظریات اور اس کی غیر رسمی تعلیم و تربیت کا بھی بڑا عمل دخل ہے۔ رسل ابھی بچہ ہی تھا کہ اس کے والدین انتقال کر گئے۔ رسل کے والد کی وصیت کی رو سے رسل اور اس کے بھائی کو ایک شخص کی تحویل میں دیا جانا تھا جس کے ان کے خاندان سے قریبی اور دوستانہ مراسم تھے لیکن بعدازاں عدالت کی دخل اندازی سے اس وصیت پر عمل درآمد روک دیا گیا اور دونوں بھائیوں کو ان کے حقیقی دادا اور دادی کی تحویل میں دے دیا گیا۔ دو سال بعد رسل کا دادا بھی چل بسا۔ رسل کی دادی نے ہی رسل کی پرورش اور تربیت میں موثر کردار ادا کیا۔ رسل نے دادی کا ذکر اپنی سوانح عمری میں نہایت محبت اور عقیدت سے کیا ہے۔ رسل کو ابتدائی تعلیم کے لیے مدرسہ نہیں بھیجا گیا بلکہ اس مقصد کے لیے شروع میں سوئس اور جرمن گورنسیں رکھی گئی تھیں اور بعدازاں ایک انگریز ٹیوٹر کا بندوبست کیا گیا تھا۔ رسل اپنی سوانح عمری میں دادی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

''میں بچپن میں ہی ان سے (دادی سے) بہت مانوس ہو گیا تھا۔ ان ہی کی شخصیت میرے لیے سب کچھ تھی۔ وہ بہت پڑھی لکھی خاتون تھیں۔ جب دیکھو کتاب لئے بیٹھی ہیں، وہ سیاست اور مذہب سے بھی لگاؤ رکھتی تھیں۔ ہم لوگوں پر سوائے اخلاقی پابندیوں کے اور کوئی پابندی انہوں نے عائد نہ کی تھی...... چودہ برس کی عمر میں آ کر میں دادی جان کے رویہ کا تجزیہ کر سکا، تب مجھے ان کی اخلاقی پاکیزگی بہت یاد آئی۔ بچوں کو جس

احساسِ تحفظ کی ضرورت ہوتی ہے، وہ مجھے ان سے ملا...... جیسے جیسے میں بڑا ہوا مجھے احساس ہوتا گیا کہ میری زندگی کو بنانے سنوارنے میں ان کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ بے خوفی، عوامی رجحانات اور روایت سے قدرے بغاوت کا جذبہ مجھے انہی سے ورثہ میں ملا۔''

۱۸۹۰ء میں رسل کیمبرج یونیورسٹی میں داخل ہوا۔ یہاں اس نے ۱۸۹۰ء سے ۱۸۹۴ء تک ریاضی اور فلسفہ کی تعلیم ''ٹرینٹی کالج'' میں حاصل کی۔ ۱۸۹۰ء سے ۱۹۰۱ء تک وہ ٹرینٹی کالج کا فیلو رہا اور پھر اسی کالج میں درس وتدریس کے فرائض انجام دیتا رہا۔ ۱۹۱۴ء میں رسل کو ٹرینٹی کالج سے اس کی آزادروی کی بنا پر نکال دیا گیا۔ ۱۹۱۹ء میں اسے ملازمت پر بحال کر دیا گیا لیکن رسل نے دوبارہ ملازمت کرنے سے انکار کر دیا۔

۱۹۱۴ء اور جنگ عظیم اول کے آغاز کے مابین کا دور وہ دور ہے جس میں ہمیں رسل فکر و تحقیق کی انتہائی بلندیاں چھوتا نظر آتا ہے۔

۱۹۱۴ء سے لے کر بیسوی صدی کے تیسرے عشرے کے اواخر تک رسل نے کوئی تعلیمی منصب حاصل نہیں کیا اور روزی کمانے کے لیے اس نے پبلک لیکچروں اور تصنیف وتالیف پر انحصار کیا۔ اس ضمن میں ''تاریخ فلسفہ مغرب'' سے اسے خاصی معقول آمدنی ہوئی۔ ول ڈیورنٹ کہتا ہے کہ برٹرینڈ رسل اصل میں دو تھے۔ ایک وہ جو جنگ عظیم اوّل کے آغاز تک زندہ رہا اور جنگ کے شروع ہوتے ہی مر گیا۔ دوسرا وہ جس نے جنگ کے بعد نیا جنم لیا۔ پہلا رسل منطقی ولسانی تجزیہ کا ماہر اور ریاضیاتی تجریدات کا عاشق تھا لیکن جنگ کے شعلوں نے اس رسل کو جلا کر بھسم کر دیا اور اس کی خاکستر سے نیا جنم لینے والا رسل ایک گہری سماجی بصیرت کا حامل اور انسان دوست نقطہ نظر کا حامی تھا۔ اس کا دل دکھی انسانیت کے آلام ومصائب پر کڑھتا تھا چنانچہ اسنے سماجی ناانصافیوں، حقوق انسانی کی پامالی اور جہالت کے خلاف پر کڑھتا تھا چنانچہ اس رسل نے سماجی ناانصافیوں، حقوق انسانی کی پامالی اور جہالت کے خلاف اعلان جہاد کر دیا۔ اس نے شروع میں ہی Principia Mathematica جیسی بلند پایہ کتاب شائع کر کے علمی حلقوں میں احترام و عزت کا مقام پیدا کر لیا تھا۔ یہ کتاب ۱۹۱۰ء، ۱۹۱۳ء کے زمانے میں چھپی تھی۔ اس کے بعد اس نے تقریباً بیس کے قریب فلسفیانہ کتابیں تحریر کیں۔ رسل کو ہم ریاضیاتی منطق کا امام کہہ سکتے ہیں۔ اس نہج پر بعد ازاں جتنی بھی ترقی ہوئی وہ رسل کی ذہنی کاوشوں ہی کا رہین منت ہے۔ یہاں یہ ذکر بے جا نہ ہوگا کہ رسل اور وائٹ نے ریاضی اور منطق کے

ملاپ سے جوز بان تخلیق کی اس سے جدید کمپیوٹر کا امکان پیدا ہوا۔

پہلی جنگِ عظیم نے رسل کی توجہ جن مسائل کی طرف مبذول کرائی، وہ مجرد علمی نوعیت کے نہیں بلکہ خالص انسانی اور سماجی نوعیت کے ہیں۔ وہ آزادروی، سماجی آزادی، آزاد تجارت، عام اور مفت تعلیم کا زبردست علمبردار تھا۔ انسان دوستی کے جذبات کے تحت ہی اس نے یہودیوں کی حمایت کی۔ متعصب انگریزوں میں اس کے خلاف سخت نفرت پیدا ہوگئی اور اس کی پاداش میں اسے قید و بند کی صعوبتیں بھی سہنا پڑیں۔

رسل نے ریاضیات، منطق، فلسفہ، مذہب اور تصوف کی حقیقت، علمیات اور متنوع سماجی اور تعلیمی مسائل پر متعدد کتب اور مضامین تحریر کیے ہیں۔ اس کے علاوہ اس نے ہلکے پھلکے مضامین اور افسانے بھی سپردِ قلم کئے ہیں۔ جو امر رسل کی عالمگیر شہرت اور عوامی مقبولیت کا باعث بنا ہے وہ اس کا عظیم منطقی اور ریاضی دان ہونا نہیں بلکہ پُرعزم انسان دوست اور عالمی امن کا سرگرم داعی ہونا ہے۔ برٹرینڈ رسل نے فروری ۱۹۷۰ء میں وفات پائی۔

اوپر یہ کہا جا چکا ہے کہ ابتدا میں رسل کی ساری دلچسپیاں ریاضی اور منطق تک محدود تھیں۔ بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں اینگلو امریکن دنیا کے اندر منطقی اثباتیت کی تحریک کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔ وٹگنسٹائن کے افکار کے زیرِ اثر وجود پذیر ہونے والی اس تحریک کا بنیادی مقصد مابعد الطبیعیاتی خرافات سے فلسفہ کی تطہیر اور اثباتی سائنسوں کے لئے مستحکم اساس کی تلاش تھا۔ منطقی اثباتی یہ کہتے تھے کہ تمام جملوں کو تین زمروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

الف: تجربی یا واقعاتی جملے۔

ب: تکراری جملے

ج: مابعد الطبیعیاتی جملے۔

تجربی یا واقعاتی جملے ان کے نزدیک اس لئے بامعنی ہیں کہ تجربہ سے ان کی تصدیق یا تکذیب ممکن ہے۔ تکراری جملے (Tautalogies) ریاضیات اور منطق کے قضایا ہیں اور اپنے اندر مساوات کا رشتہ لئے ہوتے ہیں، اس لئے انہیں بھی بامعنی کہا جا سکتا ہے۔ مثلاً ۴=۲+۲ مساوات کے دائیں طرف جو بات کہی گئی ہے وہی مساوات کے بائیں طرف بھی ہے۔ اس لحاظ سے یہ جملہ اگرچہ کوئی نئی اطلاع فراہم نہیں کرتا، تاہم

بامعنی کہلائے گا۔ جملوں کی تیسری قسم مابعدالطبیعاتی جملے ہیں جو نہ تجربی جملے ہیں اور نہ ہی تکراری۔ اس لئے انہیں بامعنی قرار نہیں دیا جاسکتا۔ معنویت صرف تجربی اور تکراری جملوں تک محدود ہے۔ اسی طرح صرف سائنس کے جملے اور ریاضی و منطق کے جملوں کو ہی یہ شرف حاصل ہے کہ وہ بامعنی یا ''وقوفی'' کہلاسکیں۔ تصوف، مذہب اور مابعدالطبیعات کے جملے اس بنا پر بے معنی ہوکر رہ جائیں گے کہ ان کی نہ تو تصدیق یا تکذیب ممکن ہے اور نہ ہی وہ اپنے اندر تکراری جملوں کی طرح مساوات کا رشتہ لیے ہوتے ہیں۔

رسل پر منطقی اثباتیت کے ان نظریات کا گہرا اثر تھا چنانچہ اس ضمن میں اس نے نہ صرف زبان کے مختلف مدارج کا نظریہ پیش کیا بلکہ ایک ایسی اشاراتی یا علامتی (Symbolic) زبان کی ضرورت کو بھی محسوس کیا جو ابہام، ذومعنویت اور فکری الجھاؤ سے پاک ہو۔ رسل اسی زبان کو سائنسی تعلیم اور وحدت علوم کے لیے ضروری خیال کرتا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ عام روزمرہ کی گفتگو میں استعمال ہونے والی زبان اعلیٰ سائنسی نظریات کے ابلاغ و اظہار کا ذریعہ نہیں بن سکتی چنانچہ اس نے جارج بوول اور وائٹ ہیڈ کے تعاون واشتراک سے ''انٹرنیشنل انسائیکلوپیڈیا آف یونیفائیڈ سائنسز'' کی متعدد جلدیں چھاپیں۔ رسل کی اس کاوش کی اساس منطق اور ریاضی کا ملاپ تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ ریاضیاتی منطق ہی ایسی بلند پایہ اشاراتی زبان کی تخلیق کرسکتی ہے جو ایک طرف مختلف سائنسز کو وحدت بخشے اور دوسری طرف خالص سائنسی اور تکنیکی نظریات کا بے عیب اور قابل اعتماد اظہار وابلاغ کرے۔ اس ضمن میں رسل نے جو کتابیں لکھیں ان میں ''اصول ریاضی''، ''فلسفہ کا خاکہ''، ''ذہن کا تجزیہ''، ''مادے کا تجزیہ'' اور ''خارجی دنیا کے بارے میں ہمارا علم'' سرفہرست ہیں۔

جیسا کہ پہلے کہا جاچکا ہے کہ سیاسی وسماجی مسائل سے دلچسپی رسل کو ورثے میں ملی تھی۔ اپنی فکری زندگی کے ابتدائی دور میں جب کہ رسل کی ذہنی و تخلیقی صلاحیتیں اپنے عروج پر تھیں وہ منطق و ریاضی کی تجریدی گہرائیوں میں مستغرق رہا اور سیاسی اور سماجی مسائل سے اس کی دلچسپی دبی رہی۔ لیکن جب جنگ عظیم کے مہیب شعلے بلند ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے اقوام عالم کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تو رسل کا حساس ذہن یہ سوچنے پر مجبور ہوگیا کہ اسے منطق و ریاضی کی روکھی پھیکی تجرید سے نکل کر زندگی کے ٹھوس اور سنگلاخ حقائق کی طرف توجہ دینا چاہیے اور جنگی جنون و وحشت جس طرح انسانی خون

کو ارزاں اور شرف انسان کو پامال کر رہے ہیں، اسے قلمی اور عملی جدوجہد سے روکنا چاہیے۔ رسل اپنی سوانح عمری میں لکھتا ہے:

''جنگ کے حالات نے مجھے بہت زیادہ متاثر کیا لیکن ان معاملات سے دستبردار ہونا میرے لیے مشکل تھا اور نہ مجھے اندازہ تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میں متشکک مزاجی کا شکار تھا۔ عجب قسم کا چڑ چڑا پن مزاج کا حصہ بن گیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ احتجاج کرنا میرا فرض ہے۔ سچائی کا دلدادہ ہوتے ہوئے میں شریک جنگ اقوام سے ناراض رہتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ بہت سے افراد تہذیب وتمدن کے ہمنوا ہوتے ہوئے بھی انسان کو دور وحشت کی طرف واپس لے جانا چاہتے ہیں۔''

رسل کو جس بات کا بہت زیادہ دکھ تھا وہ یہ تھی کہ عوام کی اکثریت بھی جنگ کی حامی بن گئی تھی۔ جنگی جنون نے فوج و سیاسی طالع آزماؤں کو ہی نہیں بلکہ گلیوں محلوں میں عام لوگوں اور بہت سے دانش وروں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا وہ لکھتا ہے:

''میں جنگ کی تباہ کاریوں کے بارے میں سوچتا رہتا تھا اور میرا ذہن ماؤف ہو کر رہ گیا تھا۔ سب سے بڑا خطرہ جو ہر دم مجھے لاحق رہتا تھا یہ تھا کہ معصوم افراد کے مصائب بڑھ جائیں گے۔ لیکن ہمارے ملک کی بچانوے فیصد آبادی ازحد خوش تھی۔ میں ان دنوں تحلیل نفسی کے بارے میں کچھ بھی معلومات نہیں رکھتا تھا مگر انسانیت کے جذبے سے سرشار رہ کر، طبع انسان کے ذہنی مسائل کے بارے میں غور وفکر میں مصروف رہتا۔ میرا خیال تھا کہ اولاد والدین کو بہت عزیز ہوتی ہے مگر جنگ کے اثرات نے عام افراد کے ان جذبات کو ماند کر دیا۔ میرا گمان تھا کہ مال و دولت کی چاہت لوگوں کو بزدل بنا دیتی ہے مگر جنگ نے لوگوں کو دھن دولت کی محبت سے بھی بے نیاز کر دیا تھا۔''

رسل آگے چل کر لکھتا ہے:

''میرا عقیدہ تھا کہ دانشور طبقہ حق وانصاف کا علمبردار ہوتا ہے مگر پتہ چلا کہ صرف دس فیصد لوگ حق گوئی اور حقیقت پسندی کے روادار تھے...... جنگ کسی صورت میں بھی انسان کی فلاح و بہبود کے لیے نہیں لڑی جارہی تھی، بلکہ سیاسی بالادستی منوانے کا ایک عجیب حربہ تھا۔ اسی سوچ نے مجھے سیاستدانوں سے متنفر کر دیا...... جیسے ہی جنگ شروع ہوئی مجھے محسوس ہوا کہ کوئی قدرتی آواز تھی جو میرے اندر نئی روح پھونک رہی تھی۔ میں نے دل

میں ٹھان لی تھی کہ مجھے ہر قیمت پر جنگ کی مخالفت کرنا ہوگی، چاہے میرے احتجاجی استد لال کو کتنا ہی مہمل اور ناکارہ کیوں نہ تصور کیا جائے۔ جملہ جنگجو اقوام کے پروپیگنڈے نے مجھے مزید مضمحل کر کے رکھ دیا اور جنگ نواز ممالک کی پالیسیاں مجھے بہت بے قرار کرتی تھیں۔ میں حق پرست اور حقیقت پسند شخص تھا۔ میں تہذیب وتمدن کا فریفتہ تھا مگر اس زمانے کی جنگی پالیسیاں دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے ہم وحشت اور بربریت کے دور کی طرف مراجعت کر رہے ہیں۔''

رسل نے اخبارات اور رسائل میں جنگ کے خلاف بہت سخت مضامین لکھے۔ اس کے علاوہ اس نے جبری بھرتی کے خلاف عملی طور پر بھی مہم چلائی کہ معصوم لوگوں کو جنگ کی بھٹی میں جھونکنا سماجی اور اخلاقی طور پر انتہائی معیوب اور ناپسندیدہ ہے۔ چنانچہ اس جرم کی پاداش میں اسے ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء تک کا زمانہ قید وبند کی صعوبتیں سہتے ہوئے گزارنا پڑا۔

جب رسل کو جیل لے جایا جارہا تھا تو ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ جیل کے وارڈن نے رسل کے کوائف کا اندراج ایک رجسٹر میں کرتے ہوئے اس سے اس کے مذہب کے بارے میں پوچھا۔ رسل نے جواب دیا کہ میں ایک لاادری (Agnostic) ہوں۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ میں نہ تو یہ جانتا ہوں کہ خدا ہے اور نہ ہی یہ جانتا ہوں کہ وہ نہیں ہے۔ وارڈن نے اس لفظ کے ہجے پوچھے اور رجسٹر میں اندراج کرتے ہوئے کہا ''دنیا میں بہت سے مذاہب ہیں...... اور شاید ہی بھی ایک مذہب ہے...... مگر میرا خیال ہے کہ ہر مذہب کے لوگ ایک ہی خدا کے ماننے والے ہیں۔'' رسل کو ستمبر ۱۹۱۸ء میں جیل سے رہائی نصیب ہوئی۔

جنگ کے خلاف رسل نے جو مہم چلائی اس سے اسے یہ تکلیف دہ سبق ملا کہ صرف حکومتی اور سیاسی راہنما ہی جنگی جنون اور انتقامی جذبات کا شکار نہیں ہوتے بلکہ عوام الناس کی اکثریت بھی اس رو میں بہہ جاتی ہے اور جنگ وجدل اور قتل وغارت سے ایک قسم کا حظ اور مسرت حاصل کرتی ہے۔ اس سے رسل اس نتیجہ پر پہنچا کہ ہماری تہذیب میں انسانوں کی اکثریت آج بھی اپنی فطرت کی گہرائیوں میں وحشت وبربریت، جوش انتقام اور تخریبی رویوں کو پنہاں رکھتی ہے چنانچہ بہتر دنیا کی تشکیل اور پائیدار امن کے قیام کے

لیے ضروری ہے کہ انسان کے نفسیاتی رویوں میں بنیادی تبدیلیاں پیدا کی جائیں۔ رسل کے اندر ایسی بنیادی نفسیاتی تبدیلیوں کی خواہش اتنی شدید تھی کہ وہ فلسفہ اور ریاضی کی تجریدی اور نصابی دنیا سے نکل کر سماجی اور سیاسی مسائل کی پرخار وادی میں اتر آیا۔

نظام بندی (System Building) فلسفے کی ایک نمایاں روایت رہی ہے۔ قدیم فلاسفہ افلاطون اور ارسطو ہوں یا جدید فلاسفہ ڈیکارٹ اور اسپوزا، انہوں نے بڑے بڑے نظام ہائے فکر پیش کیے۔ ایک فلسفیانہ نظام فکر کی بنیادی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس میں متعلقہ مفکر ایک بنیادی بصیرت یا اساسی اصول کا ادراک کرتا ہے اور اس کو حیات و کائنات کے تمام پہلوؤں پر پھیلا دیتا ہے۔ افلاطون کو دیکھیے، اُسے اعیان و امثال کی معروضیت کا وجدان حاصل ہوا چنانچہ اس کی مابعد الطبیعیات ہو یا علمیات، سیاست و اخلاق کے مسائل ہوں یا طبیعیات و فلکیات کے قوانین، سب پر اسی وجدان کا گہرا رنگ چڑھا ہوا نظر آئے گا۔ یہی حال ارسطو، ڈیکارٹ، اسپنوزا، لائبز وغیرہ کا ہے۔ نظام بندی کی یہ روایت ہیگل کے فلسفہ پر آ کر منتج ہوتی ہے۔ ہیگل کے بعد کا دور عمومی طور پر نظام بندی کا دور نہیں بلکہ فکری تحریکات کا دور ہے۔ جس میں ہمیں منطقی اثباتیت، وجودیت، جدلیاتی مادیت وغیرہ کی فکری تحریکیں نمایاں طور پر نظر آتی ہیں۔ ایک فکری تحریک میں یہ نہیں ہوتا کہ کسی اساسی وجدان سے حیات و کائنات کے بارے میں مختلف نظریات کو منطقی طور پر مستنبط کیا جائے، اس کے برعکس کسی فکری تحریک کے ارکان چند بنیادی حقیقتوں کو اصولی طور پر تسلیم کر کے اپنے اپنے انداز میں ان کی توضیح و تشریح کرتے ہیں۔

اس نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو رسل کو ہم نظام بند فلسفی نہیں کہہ سکتے۔ اس میں شک نہیں کہ آپ کو اس کے نصابی فلسفے میں منطقی ربط و تسلسل ضرور نظر آئے گا۔ لیکن اس کے عمرانی اور سیاسی افکار پر اس کی مابعد الطبیعیاتی اور منطقی بصیرت کا اثر نظر نہیں آتا۔ اس لحاظ سے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس کے تعلیمی، سیاسی، اخلاقی اور سماجی نظریات اس کے نصابی فلسفے کی توسیع ہیں۔ وہ برٹرینڈ رسل جو جنگ کے شعلوں میں جل کر راکھ ہو گیا تھا، خشک، متشدد اور بے رحم منطقی اور ریاضی دان تھا جو صحت فکر اور لسانی تجزیہ کی قربان گاہ پر کسی قسم کے جذبہ کو بھی ذبح کرنے سے دریغ نہیں کرتا تھا۔ لیکن پرانے رسل کی خاکستر سے نیا جنم لینے والا رسل رحم دل، جذبوں کی حدت سے پگھل جانے والا، انسانیت کی تذلیل و تحقیر پر

کڑھنے والا، انسانی حقوق کی پامالی پر آنسو بہانے والا، جہالت، وحشت اور بربریت کے خلاف سینہ سپر ہو جانے والا اور تمام بنی نوع انسان کے لیے ایک تابناک اور خوش آئند مستقبل کے خواب دیکھنے والا برٹرینڈ رسل ہے۔ یہ اپنے عمرانی، سیاسی اور تعلیمی افکار میں ایسا ہی رسل نظر آتا ہے۔ یہ رسل ہمیں ایک شاعر، ایک صوفی، ایک مصلح اور امن و آشتی کا ایک پیامبر محسوس ہوتا ہے۔ اپنی کتاب ''سائنسی نقطہ نگاہ'' کے باب ''سائنس اور اقدار'' میں وہ رقمطراز ہے:

''اگر امن اور سکون و اطمینان بہت بڑے مقاصد ہیں تو ہم خوشی اور مسرت کو ہی مقصد حیات بنا سکتے ہیں۔ جو شخص طاقت کو برائے طاقت حاصل کرنے کا خواہاں ہوتا ہے، اس کی ہوس اقتدار بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اور اسے کہیں بھی چین نصیب نہیں ہوتا۔ عاشق یا شاعر ایسے شخص سے کہیں زیادہ بہتر ہوتے ہیں کیونکہ ان کا مطلوب و مقصود ان کے لئے وجہ قرار ہوتا ہے اور اس کا خیال و تصور ہی ان کے لیے روحانی ذہنی مسرت کا باعث ہوتا ہے۔ طاقت کا پجاری ہر دم نئی سے نئی ایجاد کی دریافت میں سرگرداں رہتا ہے اور اگر وہ ایسا نہ کرے تو وہ اپنے اندر ایک خلاف سا محسوس کرتا ہے کیونکہ اس کے دماغ پر صرف طاقت کا نشہ چھایا ہوتا ہے۔ لطیف جذبات اس کے لیے اجنبی ہوتے ہیں۔ عاشق کی تسکین (واضح رہے کہ میں عشق و محبت کو وسیع ترین مفہوم میں استعمال کر رہا ہوں) جابر و قاہر کی تسکین سے کہیں زیادہ وقیع اور برتر ہے اور اسے بلند ترین مقاصد حیات میں شمار کرنا چاہیے۔ میں جب اپنی زندگی کی آخری سانسیں لے رہا ہوں گا تو مجھے یہی خیال تکلیف نہیں دے گا کہ میری متاع حیات ضائع ہو گئی ہے۔ مجھے احساس ہوگا کہ میں نے شام کے وقت افق کے کناروں کو گلنار ہوتے دیکھا ہے، صبح دم شبنم کو گلوں اور پتوں پر جھلملاتے دیکھا ہے اور کہر آلود دنوں میں برف پوش وادیوں کا نظارہ کیا ہے۔ تب میرے لئے یہ احساس باعث تسکین ہوگا کہ میں نے خشک سالی کی ماری ہوئی زمین کو موسلا دھار بارش میں جل تھل ہوتے دیکھا ہے اور کورن وال (Cornwall) کے ساحلوں پر بحر اوقیانوس کی بپھری ہوئی لہروں کو سر پٹختے دیکھا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ سائنس ان لوگوں کے لیے ایسی خوشیاں فراہم کر سکتی ہے جو بذات خود ایسے مناظر قدرت کو دیکھنے کی استطاعت نہ رکھتے ہوں۔ (۱) اگر ایسا ہو تو سائنس کا استعمال دانشمندانہ ہوگا۔ لیکن جب سائنس زندگی کو اس کی بنیادی قدروں سے محروم کر دیتی ہے تو سائنس کا کردار قابل تعریف نہیں رہتا۔ اقدار

(Values) کا دائرہ عمل سائنس کے میدان سے باہر ہے۔ ہم سائنس کو صرف اس حد تک قدر کا حامل کہہ سکتے ہیں کہ اس کی حیثیت علمی ہے لیکن اگر اسے قوت واقتدار کے وسیلہ کے طور پر دیکھا جائے تو یہ قدرے سے عاری ہے۔ سائنسی تکنیک کا صرف ایک وظیفہ ہونا چاہیے اور یہ ہے کہ انسانی زندگی کو بہتر بنایا جائے اور اگر یہ انسانی اقدار ہی کو پامال کرڈالے تو یہ قابل مذمت ہے۔''

اگرچہ رسل مختلف سماجی واخلاقی مسائل کے حل کے لیے مختلف اور متنوع نقطہ ہائے نظر اختیار کرتا ہے، تاہم یہ کہا جاسکتا ہے کہ چند بنیادی اقدار ایسی ہیں جو اس کے ان تمام نظریات میں رواں دواں ہیں۔ یہ اقدار ہیں امن، حقیقی مسرت، احترام آدمیت، بنی نوع انسان کی فلاح اور سب سے بڑھ کر آزادی۔ آزادی رسل کے نظام اقدار میں مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ فکر ونظر کی آزادی، مذہبی آزادی، آزاد تعلیم اور جنسی آزادی کا نقیب ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہمارے سماج کی تعمیر جبر پر ہوئی ہے۔ جدید معاشرہ انسانی آزادی کو کچلنے کے درپے ہے، اسی لیے فکر وعمل اور اظہار وابلاغ پر طرح طرح کی پابندیاں عائد کردی گئی ہیں۔ اس طرح جدید انسان نہ حصول مسرت کا آرزومند ہوسکتا ہے اور نہ ہی بہتر انسان بننے کی تحریک پاسکتا ہے۔ اس کی زندگی پر طرح طرح کے خطروں، اندیشوں اور مصلحتوں کے سائے منڈلاتے رہتے ہیں۔ بہتر انسانی سماجی اس وقت تک تشکیل پذیر نہیں ہوسکتا جب تک انسان کو اس کے بنیادی اور پیدائشی حق آزادی سے بہرہ مند نہیں کیا جاتا۔

آزادی کی شدید خواہش کی وجہ سے ہی رسل نے کمیونزم کی مخالفت کی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ کمیونسٹ معاشرے اور اشترا کی نظام تعلیم کے بعض پہلوؤں کی تعریف کرتا ہے، لیکن مجموعی طور پر وہ اشتراکیت کو انسان دشمن قرار دیتا ہے۔ وہ ایک ایسے معاشرے اور ایک ایسے نظام تعلیم کا خواب دیکھتا ہے جس میں انسان کی جسمانی اور ذہنی صلاحیتیں آزادانہ طور پر ارتقاء پذیر ہوسکیں۔ وہ اس معاملے میں جان ڈیوی اور ولیم جیمز کا ہمنوا ہے۔

زیر نظر کتاب میں مختلف سماجی موضوعات پر رسل کے چند اہم مضامین کا اُردو ترجمہ پیش کیا گیا ہے۔ اس مضامین میں فرد آزاد کی عبادت، کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ بعض نقاد اس مضمون کو بیسویں صدی کی بائبل قرار دیتے ہیں۔ یورپ میں یہ مضمون متعدد

جرائد و رسائل میں شائع ہوا۔ خود رسل نے بھی اسے ایک سے زیادہ مجموعہ ہائے مضامین میں شامل کیا ہے۔ یہ مضمون رسل کے سماجی فلسفہ کا ملخص ہے۔ علاوہ ازیں زیر نظر انتخاب میں آزادی نسواں، شادی، جنس اور مسرت جیسے اہم موضوعات کے مضامین بھی شامل ہیں۔

یہ اعزاز ادارہ ''مشعل پاکستان'' کو حاصل ہے کہ رسل کے سماجی فلسفہ کے اہم ترین موضوعات پر اردو زبان میں پہلی مرتبہ یہ انتخاب آپ کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ ادارہ مشعل گزشتہ دس برس سے اس سعی و کاوش میں مشغول ہے کہ مختلف سائنسی، علمی اور ادبی کتب و رسائل کے اُردو تراجم قارئین کو مہیا کرے۔ بنیادی طور پر مشعل ایک غیر کاروباری ادارہ ہے جس کے پیش نظر مالی منفعت نہیں۔ مشعل کے تحت چھپنے والی کتب کا انتخاب ان کے معیار اور ملک میں ان کی علمی ضرورت کے پیش نظر کیا جاتا ہے۔ قبل ازیں رسل کی ایک اہم کتاب ''تعلیم اور سماجی نظام'' کا اُردو ترجمہ بھی پیش کیا جا چکا ہے۔ اس کتاب کا ترجمہ بھی زیر نظر کتاب کی طرح جناب قاضی جاوید نے کیا ہے۔ قاضی صاحب کا نام محتاج تعارف نہیں۔ موصوف ایک کہنہ مشق مترجم اور بالغ نظر دانشور ہیں۔

زیر نظر کتاب کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس میں رسل کے بکھرے ہوئے سماجی افکار ایک باقاعدہ فلسفہ کی وحدت اختیار کر گئے ہیں۔ اردو زبان میں تخلیق و تحقیق کرنے والے حضرات کے لیے یہ ایک بہت بڑی سہولت ہے۔ قاضی جاوید صاحب کا یہ رواں اور سلیس ترجمہ علمی سطح پر اردو زبان کی وسعت کا باعث ہوگا۔ مجھے امید ہے کہ محققین کے علاوہ سنجیدہ ادب کے شائقین بھی اس کے مطالعے سے لطف اندوز ہوں گے۔

ملک کے معروف صحافی اور ادیب جناب مسعود اشعر ادارہ مشعل میں ایڈیٹر کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ انہوں نے جس لگن اور مختصر وقت میں اس کتاب کی طباعت و اشاعت کا اہتمام کیا ہے، اس کے لیے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

(ڈاکٹر نعیم احمد)

جامعہ پنجاب نیو کیمپس لاہور

۲۵ فروری ۱۹۹۴ء

فردِ آزاد کی عبادت

ڈاکٹر فاؤسٹ کو اُس کی سٹڈی میں میفسٹوفیلس نے آفرینش کا قصہ یوں سنایا تھا:

''فرشتوں کے طائفوں کی ابدی تعریفیں خدا کے بے زار کرنے لگی تھیں۔ کیا وہ اُن کی حمد وثنا کا مستحق نہ تھا؟ کیا اُس نے ان فرشتوں کو ابدی مسرتیں عطا نہ کی تھیں؟ اس کے بجائے کیا زیادہ خوش کن بات یہ نہ ہوگی کہ ایسی حمد وثنا حاصل کی جائے جس کا جواز نہیں اور ایسی مخلوق سے پرستش کروائی جائے جس کو وہ اذیتیں دے۔ یہ سوچ کر وہ دل ہی دل میں مسکرایا اور طے کیا کہ عظیم کھیل کھیلا جانا چاہیے۔''

''ان گنت زمانوں تک تپتا ہوا سحابیہ فضاؤں میں لڑکھتا رہا اور آخر کار صورت پذیر ہونے لگا۔ مرکزی تودے نے سیاروں کو جنم دیا اور سیارے ٹھنڈے ہوئے۔ کھولتے ہوئے سمندر اور جلتے ہوئے پہاڑ وجود میں آئے۔ سیاہ بادلوں سے تپتی ہوئی بارشوں کے طوفان امڈے، جنہوں نے ٹھوس ہوتی ہوئی بالائی سطحوں کو غرق کر دیا۔ پھر سمندر کی گہرائیوں میں زندگی کا پہلا جرثومہ نمودار ہوا اور زندگی تیزی سے حرکت کرنے لگی۔ عظیم الشان جنگل نمودار ہوئے، سمندری عفریت جنم لینے لگے۔ انسان نے جنم لیا۔ انسان سوچنے کی قوت، خیر وشر کا علم اور پرستش کی ظالمانہ پیاس کا حامل تھا اور انسان نے دیکھا کہ اس پاگل اور بے ہنگم دنیا میں ہر کوئی موت کے بے رحم ہاتھوں میں جانے سے پہلے ہر قیمت پر زندگی کے چند لمحوں کی چھینا چھپٹی میں مصروف ہے اور انسان نے کہا کہ ضرور اس کے پیچھے کوئی مقصد ہے۔ کاش ہم اسے جان سکیں اور یہ مقصد ضرور اچھا ہوگا۔ ضرور کوئی ہستی ہے جس کی ہم پوجا کریں اور ہمارے سامنے کی دنیا میں ایسی کوئی ہستی نہیں۔ تب انسان اپنی جدوجہد سے ہٹ گیا۔ اُس نے سوچا کہ خدا کا منشا یہ ہوگا کہ انسانی کاوشوں سے انتشار میں نظم پیدا کرے اور پھر جب اُس نے ان جبلتوں کی پیروی کی جو درندوں سے خدا

نے اُسے منتقل کی تھیں، تو انسان نے اُسے گناہ کا نام دیا۔ اور خدا سے معافی کا طلب گار ہوا، پھر اُسے شک تھا کہ کیا اُسے معاف بھی کیا جاسکتا ہے یہاں تک کہ اُس نے ایک خدائی منصوبہ گھڑ لیا جس کے ذریعے خدا کے غضب کو ٹھنڈا کیا جاسکتا تھا اور یہ دیکھتے ہوئے کہ حال بد ہے، انسان نے اُسے اور بھی بدتر بنالیا تاکہ مستقبل سنوارا جاسکے۔ پھر اُس نے اُس قوت کے لیے خدا کا شکر ادا کیا، جس کے ذریعے اُس نے ممکنہ مسرتوں کو بھی تیاگ دیا تھا۔ اس پر خدا مسکرایا اور جب خدا نے دیکھا کہ انسان نفس کشی میں اور پرستش میں کامل ہوگیا ہے تو اُس نے ایک اور آفتاب آسمانوں سے بھیج دیا جو انسان کے سورج سے ٹکرایا اور سب کچھ پھر سے سحابیہ میں ڈھل گیا۔''

''ہاں وہ بڑبڑایا: یہ دلچسپ کھیل تھا میں ناٹک دوبارہ رچاؤں گا۔''

سائنس اس کائنات کی جو تصویر پیش کرتی ہے وہ اس سے بھی زیادہ بے معنی اور بے مقصد ہے۔ خیر ہمارے آدرشوں کو اسی قسم کی دنیا میں جگہ بنانی ہے جو اپنے مقاصد کی کوئی پیش بینی نہیں رکھتی تھیں۔ انسان کی اصل، اُس کی نشو ونما، اس کی اُمیدیں اور خوف، محبتیں اور عقیدے سب کے سب سالمات کے حادثاتی اجتماع کا ماحصل ہیں اور یہ کہ کوئی آگ، کوئی کارنامہ، فکر کی کوئی شدت اور احساس کی گہرائی، انفرادی زندگی کو موت کے بعد برقرار نہیں رکھ سکتی۔ تمام زمانوں کی محنتوں، وفاداریوں، تخلیقی وجدانوں اور انسانی ذہن کی کامرانیوں کا مقصد بس یہ ہے کہ وہ نظامِ شمسی کی عظیم موت کے ساتھ ہی فنا ہو جائیں، انسانی حاصلات کا مندر کائناتی ملبے میں ڈھیر ہوجائے--- یہ سارے امور اگرچہ شک واختلاف سے بالاتر نہیں، لیکن اتنے یقینی ضرور ہیں کہ انہیں مسترد کر کے کوئی فلسفہ قائم نہیں رہ سکتا۔ ان سچائیوں کے حصار میں رہتے ہوئے یاس کی مضبوط اساس پر ہی روح کا مسکن تعمیر کیا جاسکتا ہے۔

اچھا تو پھر اتنی دشمن اور غیر انسانی دنیا میں انسان جیسی بے بس مخلوق اپنی اُمیدوں اور تمناؤں کو کیونکر برقرار رکھ سکتی ہے؟ یہ عجیب بھید ہے کہ اندھی لیکن قادرِ مطلق فطرت نے بالآخر ایک ایسی مخلوق کو جنم دیا ہے جو اُس کے اختیار سے ماورا نہ سہی لیکن صاحب بصیرت ہے، خیر وشر کا علم اور خود فطرت کے کاموں کا جائزہ لینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ موت فطرت کی بالادستی کی علامت ہے اس کے باوجود انسان اپنی مختصر زندگی میں

دیکھنے، بھالنے، تنقید کرنے، جاننے اور اپنے تخیل میں تخلیق کرنے کے لیے آزاد ہے۔ اس ساری کائنات میں صرف انسان کو ہی یہ آزادی میسر ہے اور یہ آزادی اُس کی خارجی زندگی کو کنٹرول کرنے والی تمام جابر قوتوں پر اُس کی برتری کا سبب بن گئی ہے۔

ہماری طرح غیر متمدن انسان بھی فطرت کی قوتوں کے روبرو اپنی بے بسی محسوس کرتا ہے لیکن اُسے اس قوت سے بڑھ کر اپنے اندر کوئی ایسی شے نہیں ملتی جس کا وہ احترام کر سکے۔ لہذا وہ اپنے دیوتاؤں کے حضور سجدے کرنے پر آمادہ رہتا ہے اور یہ بھی نہیں سوچتا کہ آیا یہ دیوتا اُس کی پرستش کے لائق ہیں یا نہیں۔ حاسد دیوتاؤں کو خوش کرنے کی اُمید میں انسان نے جو دکھ اور ذلتیں برداشت کی ہیں ان کی طویل تاریخ نہایت اذیب ناک اور دل سوز ہے۔ خوف و دشت سے کانپتا ہوا پجاری سوچتا ہے کہ دیوتاؤں کے حضور زندگی کی متاع عزیز قربان کرنے کے بعد اُن کی خون آشامی کی ہوس ٹھنڈی پڑ جائے گی۔ اور وہ مزید کی تمنا نہ کریں گے۔ اس قسم کے عقیدوں کو ہم ''ملوک'' کے مذہب کا عنوان دے سکتے ہیں، یہ عقیدے اصل میں ایسے غلاموں کی اطاعت سے عبارت ہیں جو اپنے دل کی گہرائیوں میں بھی یہ خیال نہیں اُبھرنے دیتے کہ اُن کے آقا بندگی کے قابل نہیں ہیں۔ آدرشوں کی آزادی کو چونکہ ابھی تسلیم نہیں کیا گیا، لہٰذا قوت کی پرستش آسانی سے ہوسکتی ہے۔ وہ لاکھ دکھ دے، لیکن اُس کا بے انتہا احترام کیا جاتا ہے۔

رفتہ رفتہ جب اخلاقیات مضبوط تر ہوتی ہے اور آدرشی دنیا کے تقاضے محسوس ہونے لگتے ہیں تو پرستش اگر ختم نہ بھی ہو، تب بھی اس کا رخ وحشیوں کے تخلیق کردہ دیوتاؤں سے ہٹ کر دوسرے خداؤں کی طرف ہو جاتا ہے۔ بعض لوگ آدرش کے تقاضے محسوس کرتے ہوئے بھی شعوری طور پر انہیں مسترد کرتے ہیں اور اصرار کرتے ہیں کہ ننگی قوت ہی پوجا کے لائق ہے۔ بگولوں میں سے خدا نے حضرت ایوب سے بات کی تھی تو اس میں یہی رویہ کارفرما تھا۔ خدائی قوت اور علم کی نمائش تو ہوتی ہے لیکن خدائی اچھائی کا کوئی اشارہ نہیں ملتا۔ ہمارے ان معاصرین کا رویہ بھی یہی ہے جو اپنی اخلاقیات کی بنیاد بقاء کی جدوجہد پر رکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کامیاب رہنے والے ہی بہترین ہیں۔ خیر دوسرے لوگ بھی ہیں جو اخلاقی حس پر گراں گزرنے والے اس نظریے کو تسلیم نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں کہ کسی نہ کسی پوشیدہ انداز میں حقیقت کی دنیا آدرشوں کے جہاں سے حقیقی طور پر ہم

آہنگ ہے۔اس طرزِ فکر کو عام طور پر مذہبی قرار دیا جاتا ہے۔اس طریقے سے انسان خدا کو تخلیق کرتا ہے جو قادرِ مطلق بھی ہے اور سراپا نیکی بھی اور جو موجود اور آدرش کے مابین پُر اسرار وحدت کا حامل ہے۔

بہر حال حقیقت کی دنیا تو اچھی نہیں ہے۔اس میں غلامی کا ایسا پہلو شامل ہے جس سے ہمارے خیالات کو پاک ہونا چاہیے۔ جملہ اشیا میں سے انسان کی عظمت میں اضافہ اچھی بات ہے لیکن یہ اضافہ انسان کو غیر انسانی قوت کے جبر سے ممکنہ حد تک آزادی دے کر ہی کیا جا سکتا ہے۔ جب ہم جان لیتے ہیں کہ قوت بڑی حد تک بُری ہے اور یہ کہ خیر وشر کے علم کے ساتھ انسان ایک ایسی دُنیا میں محض ذرے کی حیثیت رکھتا ہے جو دنیا خود اس قسم کے علم سے محروم ہے تو پھر ہم دوبارہ اس انتخاب سے دوچار ہوتے ہیں کہ آیا ہم قوت کی پوجا کریں یا نیکی کی؟ کیا اپنے معبود کو قائم رکھیں جو شر پر مائل ہے یا ہم اُسے اپنے ہی ضمیر کی تخلیق مان لیں؟

اس سوال کا جواب اہم ہے اور ہماری پوری اخلاقیات کو گہرے طور پر متاثر کرتا ہے۔قوت کی پرستش، جس کا ہمیں کارلائل، نطشے اور عسکریت پسندی کے نظریے نے عادی بنا رکھا ہے، اصل میں معاندانہ کائنات کے روبرو اپنے آدرشوں کو قائم رکھنے میں ناکامی سے جنم لیتی ہے، یہ بجائے خود بدی کی غلامانہ بندگی ہے۔ طاقت کے آگے ہی سر جھکانا ہے تو ہمیں اُن قوتوں کی طاقت کے آگے جھکنا چاہیے جو ان غلط حقائق کو تسلیم کرنے سے انکار کرتی ہیں جو یہ بات قبول نہیں کرتیں کہ حقائق اکثر بُرے بھی ہوتے ہیں۔ہمیں اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ہماری دنیا میں بہت سی ایسی چیزیں ہیں جو بصورت دیگر اچھی ہو سکتی تھیں اور یہ کہ ہم جن آدرشوں کو سینے سے لگائے رکھتے ہیں اور جن کو ہمیں عزیز رکھنا بھی چاہیے، اُن کی تکمیل اس دنیا میں نہیں ہوا کرتی۔ اگرچہ ان میں سے کسی شے کو بھی اندھی بہری کائنات کی تائید حاصل نہیں۔لیکن آیئے ہم سچائی، حسن اور کمال کے اُس آدرش کے لیے اپنا احترام برقرار رکھیں جس کو زندگی ہمیں حاصل کرنے نہیں دیتی۔قوت اگر بدی ہے جیسا کہ وہ دکھائی دیتی ہے تو آیئے ہم اُسے دل سے مسترد کر دیں۔ اس میں انسان کی سچی آزادی مضمر ہے یعنی صرف اُس کے آگے جھکنا جس کو نیکی کے ساتھ ہماری اپنی محبت نے تخلیق کیا ہو اور صرف اُس جنت کا احترام کرنا جو ہمارے بہترین لمحوں کی بصیرت کو انگیخت

کرتی ہوا۔عمل اور خواہش میں تو ہمیں خارجی قوتوں کے جبر کے آگے متواتر سر جھکانا چاہیےلیکن فکراور تخلیقی اپچ میں ہم آزاد ہیں۔اس معاملے میں ہم دوسرے انسانوں سے آزاد ہیں اور بے مایہ سیارے سے بھی جس پر ہمارے جسم بے بسی سے رینگ رہے ہیں۔ یہاں تک کہ جب تک ہم زندہ ہیں، ہم موت کے بے رحم ہاتھوں سے بھی آزاد ہیں۔تو آیئے ہم عقیدے کی اُس قوت کو پہلے پلے باندھ لیں جوہمیں خیر کے وژن میں متواتر زندہ رہنے کے قابل بناتی ہےاور آیئے اس وژن کے ساتھ ہم حقیقت کی دنیا میں قدم رکھیں۔

حقیقت اور آدرش میں عداوت جب پہلے پہل اجاگر ہوتی ہےتو آزادی کے اثبات کے لیے پُر جوش بغاوت اور دیوتاؤں سے غضب ناک نفرت ناگزیر دکھائی دیتی ہے۔ پرومی تھیس جیسے استقلال کے ساتھ مخالفانہ کائنات کے آگے ڈٹ جانا،اُس کے شر کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا اور تمام مصائب کو برداشت کرنا اُن سب کا فرض معلوم ہوتا ہے جو ناگزیر کے آگے جھکنے سے انکار کرتے ہیں لیکن غیظ وغضب بھی اصل میں ایک غلامی ہے، کیونکہ وہ ہمارے خیالات کواس بد دنیا سے منسلک رہنے پر مجبور کرتا ہے،خواہش کی جس شدت سے بغاوت جنم لیتی ہے،اُس میں خود اثباتی کا عنصر بھی شامل ہے جس پر غالب آنا داناؤں کے لیے ضروری ہے۔غیظ وغضب ہماری خواہشوں کی نہیں، بلکہ ہمارے خیالوں کی اطاعت ہے جب کہ وہ بے نیازانہ آزادی جس میں دانائی مضمر ہے، ہمارے خیالوں کے بجائے ہماری خواہشوں کی اطاعت میں پائی جاتی ہے۔

ہماری خواہشوں کی اطاعت سے قناعت و بے نیازی کو خوبی پیدا ہوتی ہے۔ جب کہ ہمارے خیالات کی آزادی سےفن اور فلسفے کی پوری دنیا ہی پیدانہیں ہوتی بلکہ حسن کا وژن بھی جنم لیتا ہے جس کے حوالے سے ہم آخر کار نارضا مند دنیا کو بڑی حد تک قابو میں کر لیتے ہیں۔لیکن حسن کی یہ بصیرت آزادانہ سوچ بچار اور خواہشوں کے بوجھ سے آزاد فکر کے ذریعے ہی ہاتھ آتی ہے گویا آزادی صرف ان لوگوں کونصیب ہوتی ہے جو زندگی سے وقت کےتغیر وتبدل کی زد میں رہنے والی نجی نعمتوں کی اُمیدنہیں رکھتے۔

ترک دنیا کی ضرورت بدی کے وجود کی شہادت ہے تاہم عیسائیت نے اس کا درس دیتے ہوئے ایسی دانائی کا ثبوت دیا ہے جو پرومی تھیس کے فلسفہ بغاوت سے بڑھ کر ہے۔ یہ بات مان لینی چاہیے کہ ہم جن اشیاء کی آرزو کرتے ہیں ان میں سے بعض اگرچہ

نا قابل حصول ثابت ہوتی ہیں لیکن وہ حقیقی معنوں میں اچھی ہیں۔ بعض اوقات ایسی اشیا بھی ہیں جن کی ہم آرزو کرتے ہیں لیکن وہ خالص آدرش کا جزو نہیں ہیں۔ بسا اوقات یہ عقیدہ غلط ثابت ہوتا ہے کہ جس شے کو لازماً ترک کرنا چاہیے وہ بُری بھی ہوتی ہے۔ تاہم یہ عقیدہ اُس قدر غلط بھی نہیں جس قدر بے لگام جذبہ اُسے غلط قرار دیتا ہے۔

صبر و قناعت میں ایک اور اچھا عنصر بھی ہے وہ یہ ہے کہ جب حقیقی اچھائیاں نا قابل حصول ہوں تو ان کی شدت سے آرزو نہ کرنی چاہیے۔ ہر شخص کو جلد یا بدیر عظیم ترک دنیا کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ نوجوانوں کے لیے کوئی شے بھی نا قابل حصول نہیں ہوتی۔ اگر جذبے کی تمام تر شدت کے ساتھ کسی اچھی شے کی آرزو کی جائے اور وہ پھر بھی نا قابل حصول رہے تو نوجوانوں کے نزدیک وہ پسندیدہ نہیں رہتی۔ اس کے باوجود موت، بیماری، افلاس یا فرض کے تقاضے سے ہم سب کو جان لینا چاہیے کہ یہ دنیا ہمارے لیے نہیں بنائی گئی تھی اور یہ کہ جن چیزوں کی ہم آرزو کرتے ہیں، وہ چاہے کتنی ہی خوبصورت کیوں نہ ہوں، مقدر ہمیں اُن سے محروم رکھ سکتا ہے۔ لہٰذا یہ امر بھی حوصلہ و جرأت میں شامل ہے کہ جب بد قسمتی ہمیں گھیر لے تو اپنی اُمیدوں کی تباہی کا ماتم کیے بغیر ہم اپنے خیالات کو بے سود پچھتاؤں سے محفوظ رکھیں۔ قوت کی اس قدر اطاعت نہ صرف جائز ہے بلکہ دانائی کی راہ بھی ہے۔

خیر اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ دانائی محض مجہول ترک دینا پر مبنی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ صرف ترک دنیا کے بل بوتے پر ہم اپنے آدرشوں کی پوجا کے لیے مندر تعمیر نہیں کر سکتے۔ یہ مندر تخیل میں، موسیقی میں، عقل میں پُرسکون وادی میں اور گیتوں کی سنہری شام میں نمایاں ہوتا ہے جہاں دکھ درد کے سائے، تبدیلی کے خوف اور حقیقت کی دنیا کی ناکامیوں اور مایوسیوں سے دور حسن جلوہ نما ہوتا ہے۔ ان چیزوں پر غور و فکر سے ہمارے دلوں میں جنت کا وژن صورت پذیر ہوتا ہے یہ وژن ہمیں گرد و پیش کی دنیا کا جائزہ لینے کا پیمانہ مہیا کرتا ہے اور وہ تخلیقی تحریک بھی عطا کرتا ہے۔

نا تواں بغاوت کی تلخی کے بغیر جب ہم مقدر کے خارجی غلبے کے آگے سر تسلیم خم کرنا سیکھ لیتے ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی جان لیتے ہیں کہ غیر انسانی دنیا ہماری پرستش کے قابل نہیں تو پھر آخر کار غیر شعوری کائنات کی نئی تشکیل اور اُسے اپنے تخیل کے مطابق ڈھالنے کی

کوشش ممکن ہو جاتی ہے۔ یوں مٹی کے بوسیدہ بت کی جگہ ایک نیا سنہری صنم لے لیتا ہے۔ دنیا کی ساری حقیقتوں--- درختوں، پہاڑیوں اور بادلوں کی مرئی صورتوں، انسان کی زندگی کے واقعات، یہاں تک کہ موت کی ہمہ گیری میں بھی تخلیقی آدرش پسندی کی بصیرت ایک ایسے حسن کا عکس دیکھ سکتی ہے جس کی صورت میں گرمی پہلے پہل اُس کے اپنے خیالات نے کی تھی۔ اس طریقے سے ذہن فطرت کی بے شعور قوتوں پر اپنی لطیف برتری کا اثبات کرتا ہے۔ جس قدر شر انگیز مواد سے اُس کا واسطہ پڑتا ہے، اتنی ہی زیادہ کامیابی اُسے غیر رضا مند چٹان کو اپنا پوشیدہ خزانہ ظاہر کرنے پر مجبور کرنے میں ہوتی ہے۔ یوں وہ مخالف قوتوں کو اپنے آگے بے بس کر کے فخر انگیز کامیابی سے ہم کنار ہوتا ہے۔

جملہ فنون میں سے المیہ سب سے شاندار ہے کیونکہ وہ اپنا روشن قلعہ دشمن کے دل میں تعمیر کرتا ہے۔ اُس کے ناقابل تسخیر واچ ٹاورز سے دشمن کے سارے کیمپ، بارود خانے، لشکر اور قلعے عریاں ہو جاتے ہیں۔ اُس کی چار دیواری میں آزاد زندگی رواں دواں رہتی ہے جب کہ موت، دکھ اور یاس کے لشکر اور مقدر کی اندھی بہری قوتیں نئے تماشوں سے اس سے پاک شہر کے باسیوں کو محظوظ کرتی ہیں۔

ایک خوبی ایسی ہے جس کو ٹریجڈی کا حسن نمایاں نہیں کرتا اور جو ہمیشہ اور ہر جگہ کسی نہ کسی طور زندگی میں موجود رہتی ہے۔ موت کے منظر میں، ناقابل برداشت درد کو سہنے میں اور بیتے ہوئے ماضی کے پلٹ کر نہ آنے میں ایک ایسا تقدس، ایک ایسا جلال، اتھاہ وسعتوں اور گہرائیوں کا احساس اور وجود کا ختم نہ ہونے والا بھید ہے جس کے حوالہ سے دکھ اُٹھانے والا دنیا کے ساتھ درد کے رشتے سے بندھا رہتا ہے۔ بصیرت کے ان لمحوں میں ہم روزمرہ زندگی کی عارضی خواہشوں اور چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لیے تگ و دو سے ماورا ہو جاتے ہیں۔ انسانی رفاقت کی ٹمٹماتی روشنی ہماری کشتی کے گرد پھیل جاتی ہے اور ہم اُس سیاہ سمندر کی جھلک دیکھتے ہیں جس کی لڑکھڑاتی لہروں پر ہم چند ساعتوں کے مسافر ہیں۔ دشمن قوتوں میں گھری ہوئی انسانیت کی تنہائی ہماری روح پر اجاگر ہوتی ہے اور ہم جان لیتے ہیں کہ ہماری اُمیدوں اور وسوسوں سے بے نیاز کائنات کے سارے بوجھ کو ہمیں تنہا ہی اُٹھانا ہے تاریک قوتوں کے خلاف جدوجہد میں کامیابی ہی عظیم لوگوں کی شاندار رفاقت حاصل کرنے کا وسیلہ ہے۔ خارجی دنیا کے ساتھ اس پُر جلال مجادلہ سے

دانش اور ہمدردی پیدا ہوتی ہے اور ان کے جنم سے ایک نئی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ موت، تبدیلی، ماضی کی ناواپسی اور کائنات کی اندھی و بے معنی عجلت کے روز بروز انسان کی بے بسی جیسی عظیم قوتوں کے ہاتھوں میں ہم کٹھ پتلی دکھائی دیتے ہیں لیکن ان قوتوں کو روح کے مندر میں لانا، ان کو محسوس کرنا اور جاننا ان پر قابو پانے کے مترادف ہے۔

ماضی کی ساحرانہ قوت کا بھید یہی ہے۔ اُس کی ساکن اور خاموش تصویروں کی دلکشی خزاں کے آخری ایام کی سحر انگیز پاکیزگی جیسی ہے۔ ماضی بدلتا ہے اور نہ ہی مقابلہ کرتا ہے۔ اُس کی لہریں زندگی کی ساری عارضی چیزوں کو بہا کر لے جاتی ہیں۔ ہاں، جو کچھ حسین اور ابدی ہے، وہ سیاہ رات میں چمکنے والے ستاروں کی مانند باقی رہ جاتا ہے۔ جو روح اُس کے حسن کے قابل نہیں، وہ اُس کا بوجھ نہیں اُٹھا سکتی۔ البتہ جو روح مقدر کو زیر کر لیتی ہے، اس کے لیے یہ مذہب کی کلید ہے۔

باہر سے نگاہ ڈالیے تو فطرت کی قوتوں کے مقابلے میں انسان کی زندگی حقیر ہے۔ انسان وقت، مقدر اور موت کی پوجا کرنے پر مجبور ہے کہ وہ اُس کی اپنی قوتوں سے بڑھ کر ہیں۔ بات یہ بھی ہے کہ اُس کی تمام تر خواہشوں، آرزوؤں اور اُمنگوں کو فطرت کی یہ قوتیں ہڑپ کر جاتی ہیں۔ ان قوتوں کی عظمت بجا سہی، لیکن ان کے بارے میں سوچنا، ان کی بے جذبہ شان و شوکت کو محسوس کرنا اصل میں اُن سے عظیم تر ہے۔ ایسے ہی خیالات ہمیں آزاد انسان بناتے ہیں تب ہم مشرقی طرز کی غلامی کے ساتھ فطرت کی ان قوتوں کے حضور سجدہ ریز نہیں ہوتے بلکہ انہیں اپنی ذات میں جذب کر لیتے ہیں، انہیں اپنا جزو بنا لیتے ہیں۔ ذاتی مسرتوں کے لیے جدوجہد ترک کرنا، عارضی خواہشوں کے جال سے نکلنا اور ابدی چیزوں کی آرزو میں جلنا ہی اصل میں نجات ہے اور یہی فرد آزاد کی عبادت ہے۔ یہ آزادی مقدر کے گیان دھیان سے حاصل ہوتی ہے کہ خود مقدر بھی اس ذہن کے تسلط میں آ جاتا ہے جو وقت کی کندن بنانے والی آگ کے لیے پاک کرنے کو کچھ نہیں چھوڑتا۔

ہم جنسوں کے ساتھ مشترک مقدر کے مضبوط ترین رشتے میں بندھا ہوا فرد آزاد محسوس کرتا ہے کہ اُسے روزمرہ زندگی کے ہر قدم پر محبت کی روشنی بکھیرنے والی بصیرت مل گئی ہے۔ انسان کی زندگی اندھیری رات میں ایک طویل سفر ہے جس میں غیر مرئی دشمن

اُسے گھیرے رکھتے ہیں اور دکھ درد اُس کی راہ روکتے ہیں، اندھیرے کا یہ سفر ایک ایسی منزل کی طرف ہے جہاں تک پہنچنے کی اُمید صرف چند لوگ ہی کر سکتے ہیں اور جہاں کوئی بھی زیادہ عرصے تک رک نہیں سکتا۔ ساتھ ساتھ قدم اُٹھاتے ہوئے ہمارے ساتھی نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ موت کے بے رحم ہاتھ انہیں نادیدہ دنیاؤں میں پھینک دیتے ہیں وہ وقت بہت مختصر ہوتا ہے جب ہم اُن کی مدد کر سکتے ہیں اور جس میں اُن کی خوشیوں اور دکھوں کا فیصلہ ہوتا ہے۔ تو آیئے ہم ان کی راہ روشن کریں، ہمدردی کے مرہم سے ان کی محرومیوں کو کم کریں، انہیں سدا بہار محبت کی مسرت عطا کریں، گرے ہوئے حوصلوں کو سہارا دیں اور پاس کے لمحوں میں یقین مہیا کریں۔

دوسروں کی خوبیوں اور خامیوں سے بے نیاز ہو کر ہمیں ان کی ضرورتوں، محرومیوں اور دکھوں پر توجہ دینی چاہیے، ہمیں بھولنا نہ چاہے کہ ہماری طرح وہ بھی سب زندگی کے بوجھ تلے دبے ہوئے ہیں۔ ہم سب ایک ہی المیہ کے کردار ہیں۔ اس لیے جب اُن کا وقت ختم ہوا اور جب ماضی کی ابدیت ان کی اچھائیوں اور برائیوں کو تغیر و تبدیل سے ماورا کر دے تو ہم یہ محسوس کریں کہ جہاں کہیں انہوں نے دکھ اُٹھایا، جہاں کہیں وہ ناکام ہوئے تو ہمارے لئے کوئی ضرورت اس کا سبب نہ تھی بلکہ جب بھی کبھی ان کے دلوں میں خدائی شعلہ لپکا تو اس وقت ہم عملاً ان کا حوصلہ بڑھانے پر آمادہ تھے۔

انسان کی زندگی مختصر ہے اور لاچار بھی۔ ساری انسانی نسل بے رحم اور سیاہ مقدر کی ٹھوکر میں ہے۔ خیر و شر سے بے نیاز، تباہی و بربادی سے بے فکر قادر مطلق مادہ اپنی سفاک حرکت جاری رکھے ہوئے ہے۔ آج ہم اپنے محبوب سے محروم ہوتے ہیں تو کل خود ہمیں اتھاہ اندھیرے میں گم ہو جانا ہے۔ ایسے میں باوقار خیالات ہی ہمارے مختصر وقت کو عظمتوں سے ہم کنار کرتے ہیں۔

میرا عقیدہ

انسان فطرت کا جزو ہے، اُس کا حریف نہیں۔ اُس کے خیالات اور جسمانی حرکات انہی قوانین کی پابند ہیں جو ستاروں اور ایٹموں پر حکمران ہیں۔ انسان کی نسبت سے طبعی دنیا بڑی ہے بلکہ یوں کہیے کہ اُس سے بھی زیادہ وسیع وعریض ہے جتنی کہ دانتے کے زمانے میں سمجھی جاتی تھی۔ تاہم یہ دُنیا اتنی بھی بڑی نہیں جتنی کہ وہ سوڈیڑھ سوسال پہلے معلوم ہوتی تھی۔ سائنس اُس کی حدوں کو چھوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ ہماری کائنات مکان میں محدود حدود کی حامل ہے اور یہ کہ روشنی اُس کے گرد چند کروڑ برسوں میں سفر کرسکتی ہے۔ یہ بھی سمجھا جاتا ہے کہ مادہ الیکٹرونز اور پروٹونز سے تشکیل پاتا ہے جو حجم میں متناہی ہیں اور دنیا میں اُن کی تعداد بھی لامحدود نہیں۔ پہلے یہ فرض کیا جاتا تھا کہ اُن کے تغیر وتبدل میں تسلسل پایا جاتا ہے لیکن اب تسلسل میں یقین نہیں رکھا جاتا اور کہا یہ جاتا ہے کہ الیکٹرونز اور پروٹونز میں تبدیلیاں جھٹکوں کے ذریعے پیدا ہوتی ہیں۔ یہ جھٹکے ایک خاص حد تک کم از کم جھٹکوں سے چھوٹے نہیں ہوتے۔ ان تبدیلیوں کے قوانین کو چند بہت ہی عمومی اصولوں کی صورت میں بیان کیا جاسکتا ہے۔ کائناتی تاریخ کا کوئی مختصر حصہ علم میں آجائے تو یہ قوانین اُس کے ماضی اور مستقبل کا تعین کرتے ہیں۔

یوں ہم دیکھتے ہیں کہ طبعی سائنس ایک ایسے مرحلے کی طرف بڑھ رہی ہے جہاں وہ مکمل ہو جائے گی۔ گویا وہ غیر دلچسپ بھی ہو جائے گی۔ الیکٹرونز اور پروٹونز پر حکمرانی کرنے والے قوانین دستیاب ہوں تو باقی سارا کام جغرافیہ ہی رہ جائے گا، اس سے مراد مخصوص حقائق کا مجموع ہے جو کائناتی تاریخ کے حصے میں اُن کی تقسیم کے بھید کھولتا ہے۔ کائناتی تاریخ کے تعین کے لیے درکار جغرافیائی حقائق کی تعداد غالباً محدود ہی ہے۔ نظری طور پر ان سب کو ایک ضخیم کتاب میں محفوظ کیا جاسکتا ہے جس کو حساب کتاب کرنے والی کسی مشین سے منسلک کر کے سمرسٹ ہاؤس میں رکھا جاسکتا ہے۔ جب مشین کا ہینڈل گھمایا

جائے گا تو وہ طالب علم کو ریکارڈ شدہ زمانوں کے علاوہ دیگر ادوار کے حقائق جاننے میں مدد مہیا کر سکے گی۔ ظاہر ہے دریافت کاری کا ایسا عمل نہایت ہی پھسپھا ہوگا۔ یہ ایسے ہی ہے کہ ایک اونچے پہاڑ پر چڑھا جائے اور چوٹی پر جا کر معلوم ہو کہ وہاں بس ایک ریسٹورنٹ ہی ہے جس میں خنجر بیئر کے سوا کچھ دستیاب نہیں اور یہ کہ ریسٹورنٹ کے گرد گہری دھند ہے لیکن اُس میں ایک وائرلیس بھی نصب ہے۔

یہ ہے وہ بے لطف کائنات، انسان جس کا ایک حصہ ہے۔ دوسرے مادے کی طرح انسان کا جسم بھی الیکٹرونز اور پروٹونز سے بنا ہے۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے، انسانی جسم بھی انہی قوانین کا پابند ہے جو حیواناتی اور نباتاتی دنیا کے علاوہ ساری کائنات پر حاوی ہیں۔ کچھ لوگوں کا دعویٰ ہے کہ فزیالوجی کو کبھی بھی فزکس میں تحلیل نہیں کیا جاسکتا۔ تاہم اُس کے دلائل متاثر کن نہیں ہیں اور انہیں غلطی پر خیال کرنا دانش مندانہ ہی لگتا ہے۔ جس شے کو ہم اپنے خیالات کا عنوان دیتے ہیں اُس کا دارومدار دماغ میں موجود پگڈنڈیوں کی تنظیم کاری پر اُسی طرح دکھائی دیتا ہے جس طرح عام سفر کا انحصار سڑکوں اور ریلوے لائنوں پر ہے۔ سوچنے کے عمل میں صرف ہونے والی توانائی کسی کیمیکل عمل سے پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ آیوڈین کی کمی ہو تو چالاک ہوشیار شخص بھی احمق بن جاتا ہے۔ ذہنی مظاہر جسمانی ڈھانچے سے منتھی دکھائی دیتے ہیں۔ اگر یہ باتیں درست ہیں تو پھر ہم یہ فرض نہیں کر سکتے کہ کوئی ایک الیکٹرون یا پروٹون ''غوروفکر'' کرسکتا ہے۔ یہ ویسے ہی ہے جیسے ہم کسی ایک شخص سے تن تنہا فٹ بال کا میچ کھیلنے کی توقع نہیں کر سکتے۔ اسی طرح ہم یہ امید بھی نہیں کر سکتے کہ جسمانی موت کے بعد بھی کسی شخص کا غوروفکر کا عمل جاری رہتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ موت دماغ کی تنظیم کو ختم کر دیتی ہے اور دماغی پگڈنڈیوں کو بروئے کار لانے والی توانائی کو منتشر کر دیتی ہے۔

خدا اور ابدیت جو مذہب کے دو بنیادی عقیدے ہیں سائنس میں ان کے لیے کوئی تائید نہیں ملتی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ مذہب کے لیے یہ دونوں عقیدے ناگزیر ہیں، کیونکہ بدھ مت میں یہ دونوں ہی نہیں ملتے۔ تاہم عیسائیت اور بعض دوسرے مذاہب میں ان دونوں عقیدوں کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ خیر سائنس ان کی تائید نہ کرے تو بھی لوگ ان پر ایمان رکھتے رہیں گے۔ وجہ یہ ہے کہ یہ دونوں عقیدے خوش گوار ہیں۔ تاہم جہاں

تک میرا تعلق ہے مجھے ان میں سے کسی کی بھی بنیاد دکھائی نہیں دیتی۔ میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ میں ثابت کرسکتا ہوں کہ خدا وجود نہیں رکھتا لیکن میں یہ بھی تو ثابت نہیں کرسکتا کہ شیطان کا وجود محض فسانہ ہے۔ مسیحی خدا موجود ہوسکتا ہے تو اسی طرح اولمپس کے دیوتا، قدیم مصر اور بابئل کے دیوتا بھی موجود ہوسکتے ہیں۔ تاہم اُن سب کا وجود ایک دوسرے سے زیادہ یقینی نہیں ہے۔ وہ نہ صرف حقیقی بلکہ امکانی علم کی حدود سے بھی ماورا ہیں لہٰذا ان میں سے کسی ایک کے بارے میں بھی غوروفکر کا کوئی جواز نہیں ہے۔ اس مسئلے پر یہاں میں زیادہ تفصیل سے بات نہیں کروں گا۔ اپنی کتاب Philosophy of Leibniz کے پندرہویں باب میں اس مسئلے پر میں روشنی ڈال چکا ہوں۔

فرد کی بقا یا فرد کی ابدیت کے مسئلے کی نوعیت کسی قدر مختلف ہے۔ اس مسئلے پر دونوں طرف شہادت ممکن ہے، افراد روزمرہ کی دنیا کا حصہ ہیں، جس سے سائنس کا تعلق ہے۔ افراد کے وجود کا تعین کرنے والے حالات کو دریافت کیا جاسکتا ہے۔ پانی کا کوئی قطرہ لافانی نہیں ہوتا۔ اُس کو آکسیجن اور ہائیڈروجن میں تحلیل کیا جاسکتا ہے۔ اب اگر پانی کا قطرہ یہ دعویٰ کرنے لگے کہ اُس میں ایک ایسی آبی صفت موجود ہے جو قطرے کے فنا ہونے کے بعد بھی موجود رہتی ہے، تو پھر ہم شبے میں پڑ جائیں گے۔ اسی طرح ہم جانتے ہیں کہ انسانی دماغ فانی نہیں اور یہ کہ جب موت واقع ہوتی ہے تو کسی زندہ جسم کی منظّم توانائی جامد ہوجاتی ہے لہٰذا وہ جسمانی عمل کے لیے دستیاب نہیں رہتی۔ تمام شہادتیں ظاہر کرتی ہیں کہ جس شے کو ہم اپنی ذہنی زندگی قرار دیتے ہیں، وہ دماغ کے ڈھانچے اور منظّم جسمانی توانائی سے منسلک ہے۔ گویا یہ فرض کرنا بالکل معقول بات ہے کہ جسمانی زندگی کے خاتمے کے ساتھ ہی ذہنی زندگی بھی ختم ہوجاتی ہے۔ یہ استدلال حتمی کے بجائے امکانی نوعیت کا حامل ہے۔ تاہم یہ اس قدر مضبوط ضرور ہے جس قدر وہ دوسرے دلائل جن پر اکثر سائنسی نتائج کی بنیاد ہے۔

بہرطور اس نتیجے پر کسی حوالوں سے تنقید کی جاسکتی ہے۔ نفسیاتی تحقیق دعویٰ کرتی ہے کہ اُس کے پاس موت کے بعد بقا کی حقیقی سائنسی شہادت موجود ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ اصولی طور پر اس کا طریقہ کار سائنسی طور پر درست ہے، اس قسم کی شہادت اتنی متاثر کن ہوسکتی ہے کہ کوئی سائنسی مزاج رکھنے والا شخص اُسے مسترد ہی نہ کرسکے۔ تاہم اس

شہادت کے ٹھوس ہونے کا دارومدار اُس امر پر ہے کہ بقا کا متعلقہ مفروضہ کسی حد تک ٹھوس ہے۔ مظاہر کے ہر سیٹ کی توجیہہ مختلف طریقوں سے کی جاسکتی ہے اور ان میں سے ہمیں ایسے طریقے کو ترجیح دینی چاہیے جو مروجہ طور پر زیادہ قرین قیاس ہو۔ جو لوگ پہلے ہی یہ خیال کرتے ہوں کہ زندگی موت کے بعد بھی برقرار رہتی ہے وہ فوراً ہی اس نظریے کو نفسیاتی مظاہر کی بہترین توجیہہ کے طور پر قبول کرلیں گے لیکن جو لوگ بعض دوسری وجوہ سے اس نظریے کو ناکافی سمجھیں وہ دیگر توجیہات کی جستجو کریں گے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے، میں سمجھتا ہوں کہ بقا کے حق میں نفسیاتی تحقیق سے جو شہادت حاصل ہوئی ہے وہ اس کے برعکس نقطہ نظر کی تائید میں حاصل شدہ فزیالوجیکل شہادت کے مقابلے میں بہت کمزور ہے۔ تاہم میں یہ ماننے کو تیار ہوں کہ یہ شہادت کسی وقت بھی مضبوط ہوسکتی ہے، تب بقا پر یقین نہ رکھنا غیر سائنسی رویہ قرار پائے گا۔

بہرطور ہمیں یہ امر پیش نظر رکھنا چاہیے کہ جسمانی موت کے بعد بقا کا معاملہ ابدیت سے مختلف مسئلہ ہے۔ اس کا مطلب نفسیاتی موت میں محض تاخیر بھی ہوسکتا ہے۔ انسان جس شئے کی خواہش کرتے ہیں وہ ابدیت ہے۔ ابدیت میں یقین رکھنے والے لوگ ان فزیالوجیکل دلائل پر انگلی اٹھائیں گے جس قسم کے دلائل میں پیش کرتا رہا ہوں۔ وہ یہ دعویٰ کریں گے کہ روح اور جسم دو بالکل مختلف چیزیں ہیں اور یہ کہ روح جسمانی اعضا کے ذریعے اپنے اظہارات سے بہت مختلف شئے ہے۔ میرے نزدیک یہ دعویٰ ایک مابعد الطبیعیاتی وہم ہے۔ ذہن اور مادہ دونوں حتمی حقیقتیں نہیں بلکہ خاص مقاصد کے لئے استعمال کی جانے والی عمومی اصطلاحیں ہیں۔ روح کی طرح الیکٹرونز اور پروٹونز منطقی افسانے ہیں۔ وہ مستقل ذات نہیں بلکہ دونوں درحقیقت ایک تاریخ، واقعات کا ایک سلسلہ ہیں۔ روح کے معاملے میں یہ امر نشو ونما کے حقائق سے واضح ہے۔ اگر ہم حمل کے ٹھہرنے، ماں کے پیٹ میں بچے کے نشو ونما پانے اور پھر شیر خوار کی کیفیت پر غور کریں تو سنجیدگی کے ساتھ یہ یقین کرنا ممکن نہیں رہتا کہ روح کوئی ناقابل تقسیم اور مکمل شئے ہے اور اس سارے عمل میں وہ ایک جیسی رہتی ہے۔ یہ بالکل واضح ہے کہ وہ جسم کے ساتھ نشو ونما پاتی ہے اور وہ ناقابل تقسیم نہیں ہے۔ اس کو ہم مادہ پرستی کا عنوان نہیں دے سکتے۔ یہ تو محض اس حقیقت کا اعتراف ہے کہ قابل توجہ مسئلہ بنیادی جوہر کا نہیں، بلکہ تنظیم کاری کا

معاملہ ہے۔

مابعدالطبیعیاتی مفکرین نے یہ ثابت کرنے کے لیے بے شمار دلائل دیئے ہیں کہ روح کو ابدی ہونا چاہیے۔ تاہم ان تمام دلائل کو رد کرنے کے لیے ایک سادہ سا ٹیسٹ کافی ہے۔ یہ سب صاحبان ایک جیسے انداز میں ثابت کرتے ہیں کہ روح پوری فضا میں پھیلی ہوئی ہے۔ چونکہ ہم موٹے ہونے کی اتنی خواہش نہیں کرتے جتنی طویل عمر کی تمنا کرتے ہیں، چنانچہ ان میں سے کسی بھی مابعدالطبیعیاتی مفکر نے اپنے استدلال کے اس اطلاق پر توجہ نہیں دی۔ یہ اس امر کی مثال ہے کہ کس طرح اچھے بھلے قابل افراد بھی خواہش کے حیرت انگیز اثر کے نتیجے میں ان مغالطّوں کا شکار ہو جاتے ہیں جو دوسرے لوگوں کے لیے بالکل واضح ہوتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اگر ہمیں موت کا ڈر نہ ہوتا تو پھر حیات جاوداں کا تصور ہی پیدا نہ ہوتا۔

انسانی زندگی کے بہت سے دوسرے مظاہر کی طرح مذہبی عقیدے کی بنیاد بھی خوف پر ہے۔ انفرادی یا اجتماعی طور پر انسانوں کا خوف ہماری سماجی زندگی کے بڑے حصے پر مسلط رہتا ہے۔ تاہم یہ فطرت کا خوف ہے جو مذہب کو جنم دیتا ہے۔ جیسا کہ ابھی ہم نے دیکھا، ذہن اور مادے کا تضاد کم وبیش واہمہ ہے۔ تاہم ایک اور تضاد ہے جو زیادہ اہم ہے۔ اس تضاد میں ایک طرف ایسی اشیا ہیں جو ہماری خواہش سے متاثر ہو سکتی ہیں اور دوسری طرف ایسی اشیاء ہیں جن کو خواہش کے ذریعے متاثر نہیں کیا جا سکتا۔ ان دونوں قسم کی اشیاء کے مابین فرق واضح ہے اور نہ ہی ناقابل تغیر۔ وجہ یہ ہے کہ سائنس کی ترقی کے ساتھ ساتھ زیادہ سے زیادہ اشیا انسان کے کنٹرول میں چلی آ رہی ہیں۔ پھر بھی بلاشبہ ایسی اشیا موجود ہیں جو انسانی خواہش سے بے نیاز ہی رہتی ہیں۔ ان میں ہماری دنیا کے وہ تمام بڑے حقائق شامل ہیں جن سے ماہرین فلکیات کو دلچسپی ہوا کرتی ہے۔ زمین کی سطح کے یا اُس کے قریب کے حقائق ہی ایسے ہیں جن کو ہم کسی حد تک اپنی خواہش کے مطابق ڈھال سکتے ہیں۔ تاہم زمین کی سطح پر بھی ہماری قوتیں بہت محدود ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہم موت سے نجات نہیں پا سکتے البتہ اُسے تھوڑا بہت ٹال سکتے ہیں۔

مذہب اس تضاد پر قابو پانے کی ایک کوشش ہے۔ کائنات پر اگر خدا کی حکمرانی ہے اور ہم دعا کے ذریعے خدا سے کام لے سکتے ہیں تو پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم خدا کی

قدرت کاملہ میں کسی نہ کسی حد تک شریک ہو جاتے ہیں۔ پرانے زمانے میں دعاؤں کے اثر سے معجزے رونما ہوا کرتے تھے۔ کیتھولک چرچ میں وہ اب بھی رونما ہوتے ہیں۔ البتہ پروٹسٹنٹ فرقہ والے اس قوت سے محروم ہو گئے ہیں۔ خیر معجزوں کے بغیر بھی کام چلایا جا سکتا ہے، کیونکہ خدا کا فرمان یہ ہے کہ قوانین فطرت امکانی حد تک بہترین نتائج پیدا کریں گے۔ اس طرح خدا پر ایمان اب بھی فطرت کی دنیا کو انسانی اوصاف دینے اور انسانوں کو یہ احساس عطا کرنے کا کام دیتا ہے کہ طبعی قوانین اصل میں اُن کے دوست ہیں۔ بالکل اس طریقے سے ابدی زندگی کا عقیدہ موت کی دہشت کو ختم کر دیتا ہے۔ جن لوگوں کا عقیدہ یہ ہو کہ موت کے بعد وہ ابدی نعمتوں سے نوازے جائیں گے اُن کے بارے میں ہم امید کر سکتے ہیں کہ انہیں موت کا ڈر نہ ہوگا۔ تاہم یہ طب کے پیشے سے تعلق رکھنے والوں کی خوش قسمتی ہے کہ اس قسم کا پختہ ایمان چند ہی لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔ بہر حال یہ عقیدہ موت کے خوف کو ختم نہ کرے تو بھی اُسے کسی نہ کسی حد تک کم ضرور کر دیتا ہے۔

مذہب کا منبع چونکہ دہشت ہے، اس لیے وہ بعض قسم کے خوفوں کو سرفراز کرتا ہے۔ اور لوگوں کو انہیں شرمناک نہ سمجھنے کی تلقین کرتا ہے۔ اس لحاظ سے مذہب نے نسل انسانی کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ اس کی تلقین کے برعکس اصل میں یہ ہر قسم کے خوف برے ہیں میں یقین رکھتا ہوں کہ مرنے کے بعد میرا جسم گل سڑ جائے گا۔ میری انا فنا ہو جائے گی اور کچھ باقی نہ رہے گا۔ میں جوان نہیں ہوں اور مجھے زندگی سے محبت ہے۔ لیکن مجھے فنا کے خیال پر خوف سے تھر تھر کانپنے سے نفرت ہے۔ فنا کی حقیقت کے باوجود سچی خوشی خوشی ہی رہتی ہے۔ خیال اور محبت کی قدر و قیمت محض اس لیے ختم نہیں ہو جاتی کہ وہ ابدی نہیں ہیں۔ بہت سے انسان خود داری سے پھانسی کے تختے کو چوم لیتے ہیں۔ اس خود داری کو ہمیں کائنات میں انسان کے مقام کے بارے میں سچائی سے سوچنے کا درس بھی دینا چاہیے۔ پرانے قصے کہانیوں نے ہمیں سکون مہیا کیا تھا، سائنس نے ان کو ختم کر کے ہمیں خوف زدہ کر دیا ہے لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ سائنس ہی ہمیں سچائی سے روشناس کرا سکتی ہے۔

فطرت کا فلسفہ ایک شے ہے اور قدر کا فلسفہ دوسری شے۔ ان دونوں کو گڈ مڈ کرنے سے صرف نقصان ہی پہنچ سکتا ہے۔ جس کو ہم خیر قرار دیتے ہیں یا جس کو ہم پسند

کرتے ہیں، وہ اشیا کی حقیقت کو نہیں بدل سکتی۔ فلسفہ فطرت کا تعلق اسی حقیقت سے ہے۔ بہر حال اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم محض اس لیے بعض چیزوں کو اہم نہ سمجھیں کہ غیر انسانی دنیا اُن کی قدر نہیں کرتی۔ نہ ہی ہمیں محض اس لیے کسی شے کی تعریف کرنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے کہ وہ فطرت کا قانون ہے۔ بلا شبہ ہم فطرت کا حصہ ہیں جس نے ان قوانین کے مطابق ہماری اُمنگیں، اُمیدیں اور خوف پیدا کیے ہیں جن کو اب ماہرین نفسیات دریافت کرنے لگے ہیں۔ ہم مفہوم میں فطرت کا حصہ ہیں کہ فلسفہ فطرت میں ہم فطرت کے تابع ہیں فطرتی قوانین کا ثمر ہیں اور بالآخر یہی قوانین ہمیں شکار کر لیتے ہیں۔

زمین کہکشاں کے معمولی سیاروں میں سے ایک ہے۔ اس لیے فطرت کے فلسفے کو ناروا طور پر زمین تک محدود نہ ہونا چاہیے اور نہ ہی اُسے زمین کو مرکزی حیثیت دینی چاہیے۔ فلسفہ فطرت کو اس طرح توڑنا مروڑنا مضحکہ خیز ہوگا کہ اُس سے ایسے نتائج حاصل کیے جا سکیں جو اس معمولی سے سیارے کے بے مایا طفیلیوں کو خوش کر سکیں۔ اس معاملے میں فسلفے کی حیثیت سے حیات پسندی اور ارتقا پرستی کے نظریے توازن اور منطقی تعلق کے شعور سے بے خبری کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ وہ زندگی کے حقائق کو جو ذاتی طور پر ہمارے لیے دلچسپ ہیں، صرف اس کرہ ارض تک محدود نہیں کرتے بلکہ کائناتی اعتبار سے اہم بنا کر پیش کرتے ہیں۔ کائناتی فلسفوں کے طور پر اُمید پرستی اور یاس پرستی بھی اس احمقانہ انسان پرستی کو ظاہر کرتے ہیں۔ فلسفہ فطرت کے حوالے سے ہم اس عظیم کائنات کو جس قدر جانتے ہیں اُس سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ ہماری خوشی یا غمی سے اس کا کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی وہ اچھی یا بُری ہے اس قسم کے تمام فلسفے خود کو اہم خیال کرنے کے رویے سے ظاہر ہوتے ہیں۔ اگر ہم فلکیات کا تھوڑا بہت علم حاصل کر لیں تو ان کے فریب میں نہ آئیں۔

خیر، فلسفہ قدر کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ ہم جو کچھ اپنے تخیل میں لانے کے اہل ہیں، فطرت اُس کا صرف ایک حصہ ہے ہم ہر قسم کی حقیقی یا تخیلاتی شے کی قدر کا تعین کر سکتے ہیں اور کوئی ایسا خارجی معیار موجود نہیں جو ہماری لگائی ہوئی قدر کو غلط ثابت کر سکے۔ قدر کے تعین کا مطلق اختیار خود ہمارے پاس ہے۔ اس معاملے میں گویا ہم فطرت سے عظیم تر ہیں۔ اقدار کی دنیا میں فطرت بذات خود غیر جانب دار ہے۔ وہ اچھی ہے نہ بُری، خیر ہے نہ شر۔ وہ ہماری تعریف کی مستحق ہے اور نہ ہی ملامت کی۔ یہ ہم انسان

ہیں جو قدر تخلیق کرتے ہیں اور ہماری خواہشیں قدر عطا کرتی ہیں اس سلطنت میں ہم خود بادشاہ ہیں اور جب ہم فطرت کے آگے جھکتے ہیں تو اپنی بادشاہت کی توہین کرتے ہیں ہمیں خود اچھی زندگی کا تعین کرنا ہے نہ کہ فطرت کو یا غیر فطرت کی تجسیم خدا کو۔

اچھی زندگی

مختلف زمانوں میں اور مختلف لوگوں کے نزدیک ایک اچھی زندگی کے بہت سے مختلف تصورات رہے ہیں۔ کسی حد تک ان اختلافات پر گفتگو ہو سکتی تھی۔ یہ اُس وقت ممکن تھا جب لوگ ایک طے شدہ منزل تک رسائی کے ذرائع پر ایک دوسرے سے اختلافات رکھتے تھے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ قید خانہ جرم کو روکنے کا اچھا طریقہ ہے۔ دوسروں کے نزدیک اس سلسلے میں تعلیم بہتر کردار ادا کر سکتی ہے۔ اس قسم کے فرق کو کافی حد تک شہادت دستیاب ہونے پر دور کیا جا سکتا ہے لیکن بعض اختلافات ایسے ہیں کہ اُن کا فیصلہ اس انداز سے ممکن نہیں۔ مثال کے طور پر ٹالسٹائی ہر قسم کی جنگ کی مذمت کرتا تھا۔ لیکن ایسے لوگ بھی ہیں جن کے نزدیک حق کے لیے جنگ و جدل میں زندگی بسر کرنا بڑی نیکی کی بات ہے۔ ان میں اختلاف غالبًا وسیلے کا نہیں بلکہ مقصد کے بارے میں ہے۔ جنگجو کی تعریف کرنے والے عمومًا یہ سمجھتے ہیں کہ گناہ گاروں کو سزا دینا بذات خود اچھی بات ہے۔ ٹالسٹائی کی رائے مختلف تھی۔ اس قسم کے اُمور میں کوئی استدلال ممکن نہیں۔ لہٰذا میں یہ ثابت نہیں کر سکتا کہ اچھی زندگی کے بارے میں میرا تصور درست ہے۔ میں تو بس یہ کر سکتا ہوں کہ اپنے تصور کو بیان کر دوں اور اُمید رکھوں کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اُس سے اتفاق کریں گے۔ خیر، میرا تصور یہ ہے کہ اچھی زندگی وہ ہے جو محبت سے فیضان اور عمل سے رہنمائی حاصل کرے۔

علم اور محبت دونوں بے انت ہیں۔ اُن کی کوئی حد نہیں۔ اس لیے کوئی زندگی کتنی ہی اچھی ہو جائے اُس میں بہتری کا امکان موجود رہتا ہے۔ نہ تو علم کے بغیر محبت اور نہ ہی محبت کے بغیر علم اچھی زندگی کا سبب بن سکتے ہیں۔ قرون وسطٰی میں جب کسی ملک میں کوئی مہلک وبا پھیلتی تھی تو بزرگ لوگوں کو عبادت گاہوں میں جمع کر کے خدا سے نجات کی دعائیں مانگنے کو کہتے تھے، نتیجہ الٹ نکلتا وبائیں رحم کے متلاشی ہجوموں میں غیر معمولی

سرعت کے ساتھ پھیل جاتیں۔ یہ صورت حال علم کے بغیر محبت کی مثال ہے۔ دوسری طرف حالیہ جنگیں محبت کے بغیر علم کا ماحصل ہیں۔ دونوں صورتوں میں نتیجہ وسیع پیمانے پر اموات اور تباہی و بربادی کی صورت میں نکلتا ہے۔

محبت اور علم اگرچہ دونوں ضروری ہیں، لیکن ایک لحاظ سے محبت کو اولیت حاصل ہے، کیونکہ وہ ذہین لوگوں کو علم کی جستجو پر آمادہ کرتی ہے تاکہ وہ جان سکیں کہ اپنے محبوب لوگوں کی کس طرح مدد کی جاسکتی ہے۔ لیکن اگر لوگ ذہانت سے محروم ہوں تو وہ سنی سنائی باتوں پر ایمان لاکر مطمئن ہو جاتے ہیں اس طرح وہ چاہت کے باوجود فائدے کے بجائے نقصان کا سبب بن سکتے ہیں۔ میرے نکتے کی بہترین مثال طب کے شعبے سے مل سکتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ مریض کے لیے مخلص ترین دوست کے مقابلے میں ایک لائق معالج زیادہ مفید ثابت ہوتا ہے۔ اس طرح کسی معاشرے کی صحت کے لیے جاہلانہ خلوص اور ہمدردی کے مقابلے میں طبی علم میں ترقی زیادہ مفید ہوتی ہے۔ صورت حال کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اگر سائنسی دریافتوں سے صرف امیروں کو فائدہ پہنچانا مقصود نہیں تو پھر انسان دوستی کا عنصر لازمی ہو جاتا ہے۔ محبت کا لفظ بہت سے احساسات پر حاوی ہے۔ میں نے اس لفظ کو جان بوجھ کر استعمال کیا ہے، کیونکہ میں ان تمام احساسات کو شامل کرنا چاہتا ہوں۔ جذبے کے طور پر محبت دو قطبوں کے درمیان متحرک رہتی ہے۔ (یہاں میں وضاحت کردوں کہ میرے نزدیک محبت جذبے کا معاملہ ہی ہے۔ جس شے کو اصول کے طور پر محبت کہتے ہیں، وہ مجھے حقیقی نہیں لگتی) ایک طرف غور و فکر سے حاصل ہونے والی خالص مسرت ہے اور دوسری طرف خالص فیض رسانی ہے جہاں تک بے جان چیزوں کا تعلق ہے، ان سے تعلق میں صرف مسرت ہی شامل ہوتی ہے۔ ظاہر ہے ہم کسی منظر سے کسی لینڈ سکیپ سے ہمدردی تو نہیں کر سکتے۔ اس قسم کی مسرت آرٹ کا منبع ہے۔ اصولاً یہ بالغ افراد کے مقابلے میں بچوں میں مضبوط تر ہوتی ہے کیونکہ وہ عموماً اشیا کو افادی انداز سے دیکھتے ہیں۔ جب انسانوں پر صرف جمالیاتی نقطہ نظر سے نگاہ ڈالی جائے تو یہ ہمارے احساسات میں اہم کردار ادا کرتی ہے انسانوں میں سے بعض دلفریب ہوتے ہیں اور بعض کا معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے۔

محبت کے دوسرے سرے پر سخاوت یا فیض رسانی ہے۔ کوڑھیوں کی مدد کرنے

کے لیے لوگ جانیں قربان کرتے رہے ہیں۔ اس معاملے میں ہم دیکھتے ہیں کہ ان لوگوں میں محبت کا جو جذبہ موجزن تھا اُس میں جمالیاتی مسرت کا کوئی عنصر شامل نہیں ہوسکتا۔ ماں باپ کی محبت میں بچے کی ظاہری شکل وصورت سے حاصل ہونے والی خوشی بھی شامل ہوتی ہے لیکن اگر یہ خوشی شامل نہ ہوتو بھی والدین کی محبت مضبوط ہی رہتی ہے، بیمار بچے سے ماں کی دلچسپی کو ہمدردی کا عنوان دنیا عجیب سا محسوس ہوگا کیونکہ ہم عام طور پر اس لفظ کو نسبتاً کمزور جذبے کے لیے استعمال کرنے کے عادی ہیں تاہم کسی دوسرے فرد کی فلاح و بھلائی کی خواہش کو بیان کرنے کے لیے کوئی اور لفظ تلاش کرنا مشکل ہے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ جہاں تک والدین کے احساس کا تعلق ہے یہ خواہش کسی حد تک شدید ہوسکتی ہے۔ دوسرے معاملات میں اس کی شدت کم ہوتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہر قسم کا بے غرضانہ جذبہ والدین کی محبت کی ہی کوئی نہ کوئی صورت ہوتا ہے۔ ہم اس جذبے کو یہاں ہمدردی کا نام دے سکتے ہیں۔ تاہم میں اس بات کی وضاحت ضروری خیال کرتا ہوں کہ میں یہاں اصول کا نہیں بلکہ جذبے کا ذکر کررہا ہوں۔ اس لفظ سے بسا اوقات برتری کا کوئی احساس بھی منسلک ہوتا ہے تاہم میں اُسے شامل نہیں کررہا ہوں۔

کامل ترین صورت میں محبت مسرّ اور خیر خواہی سے عبادت ہوتی ہے اور ان دونوں عناصر کو ایک دوسرے سے الگ کرنا محال ہوتا ہے۔ خوبصورت اور کامیاب بچے سے ماں باپ کو جو خوشی ہوتی ہے اُس میں یہ دونوں عناصر شامل ہوتے ہیں، یہی معاملہ بھرپور جنسی محبت کا ہے۔ تاہم جنسی محبت میں ہمدردی کا پہلو صرف اُس وقت پیدا ہوتا ہے جب یہ احساس ہو کہ دوسرا افراد پوری طرح آپ کے بس میں ہے بصورت دیگر رقابت کا احساس اُسے تباہ کردیتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ رقابت کی صورت میں غور وفکر کی مسرت بڑھ جاتی ہے۔ خیر خواہی کے بغیر مسرت ظالمانہ ہوسکتی ہے جب کہ مسرت کے بغیر خیر خواہی آسانی سے سرد مہری اور احساس برتری میں تبدیل ہوجاتی ہے۔ محبوب بننے کا آرزومند فرد ایسی محبت کا معروف بننا چاہتا ہے جس میں یہ دونوں عناصر شامل ہوں۔ البتہ شیر خوارگی یا بیماری جیسی انتہائی صورتوں میں معاملہ مختلف ہوسکتا ہے۔ ان صورتوں میں ہمدردی سے زیادہ تحسین وستائش کی آرزو کی جاتی ہے۔ حکمرانوں اور مشہور حسیناؤں کی ذہنی کیفیت ایسی ہی ہوتی ہے۔ ہم دوسرے لوگوں کیلئے نیک خواہشات کی اتنی ہی آرزو کرتے ہیں جتنی

کہ مشکل کے وقت ان کی مدد کی خواہش کرتے ہیں یا پھر اُن سے جس قدر خطرہ لاحق ہوتا ہے، یہ کم از کم صورت حال کی حیاتیاتی منطق معلوم ہوتی ہے لیکن زندگی کے مطالعے میں یہ حرف آخر نہیں۔ ہم تنہائی سے فرار یا جیسا کہ عام طور پر کہتے ہیں، ''سمجھے جانے'' کی خواہش کے تحت بھی چاہت کے طلب گار ہوتے ہیں۔ ہم جس فرد کی چاہت چاہتے ہیں، اُس کے بارے میں یہ آرزو بھی کرتے ہیں کہ وہ نہ صرف ہماری بھلائی کا طلب گار ہو بلکہ اُسے یہ بھی معلوم ہو کہ ہماری خوشی کا دارومدار کس بات پر ہے۔ خیر اس کا تعلق اچھی زندگی کے دوسرے عنصر یعنی علم سے ہے۔

کامل دنیا میں ہر حساس شخص تمام تر دوسرے حساس افراد کے لیے اُس مکمل محبت کا مرکز ہوتا ہے جس میں خوشی، ہمدردی اور افہام و تفہیم آپس میں یوں ملے ہوتے ہیں کہ انہیں ایک دوسرے سے جدا کرنا محال ہوتا ہے۔ بہر طور اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس حقیقی دنیا میں ہم لوگوں کے بارے میں اس قسم کے احساسات رکھنے کی کوشش کریں۔ بہت سے لوگ تو ایسے ہیں کہ ہم ان سے خوشی محسوس نہیں کر سکتے کیونکہ وہ کراہت انگیز ہوتے ہیں۔ اپنے آپ پر جبر کر کے اگر ہم ان لوگوں میں حسن تلاش کرنا چاہیں تو اس سے خود ہمارے احساسات ہی کند ہونے لگیں گے۔ پھر بات انسانوں کی نہیں، یہاں تو پسو، کھٹمل اور جوئیں بھی ہیں۔ ان سے خوشی حاصل کرنے کے لیے ہمیں اپنا دل پتھر کا بنانا ہوگا۔ یہ بجا ہے کہ بعض درویش اس قسم کی چیزوں کو خدا کے موتی قرار دیتے ہیں۔ لیکن درحقیقت وہ اس قسم کی باتیں کہہ کر اپنی درویشی کا رعب جمانا چاہتے ہیں۔

ہمدردی کو آسانی سے پھیلایا جا سکتا ہے، لیکن پھر بھی اُس کی حد ہوتی ہے۔ اگر کوئی شخص کسی خاتون سے شادی کرنا چاہتا ہے، لیکن محض اس لیے پیچھے ہٹ جاتا ہے کہ کوئی اور شخص اُس خاتون سے شادی کرنے کا خواہش مند ہے تو ہمیں اُس کے بارے میں اچھی رائے قائم نہیں کرنی چاہیے، اصل میں یہ مقابلے کا معاملہ ہے، رقیب کے بارے میں اُس کے احساسات ہمدرانہ ہو ہی نہیں سکتے۔ میرا خیال یہ ہے کہ اس دنیا میں اچھی زندگی کے تمام تصورات میں ہمیں حیوانی حیاتیت اور حیوانی جبلت کا عنصر شامل رکھنا چاہیے۔ اس کے بغیر زندگی بے لطف اور بے کیف ہو جاتی ہے۔ تہذیب کو اُس کی جگہ دینے کی بجائے اُس پر تہذیب کا اضافہ کرنا چاہیے۔ کنارہ کشی کی زندگی بسر کرنے والے ولی اور زندگی کو تیاگ

دینے والے درویش اس معاملے میں بھرپور انسان نہیں ہوا کرتے۔ معاشرے میں اگر اس قسم کے لوگوں کی ایک چھوٹی سی تعداد موجود ہو تو وہ معاشرے کو فائدہ پہنچا سکتے ہیں لیکن اگر دنیا میں بس سادھو اور درویش ہی ہوں تو دنیا بوریت کے ہاتھوں تباہ ہو جائے گی۔

یہ بحث بہترین محبت کے جزو کی حیثیت سے مسرت کی اہمیت بڑھا دیتی ہے۔ اس حقیقی دنیا میں مسرت ناگزیر طور پر محدود ہے اور وہ تمام نسل انسانی کے بارے میں یکساں احساسات رکھنے میں مانع ہوتی ہے۔ مسرت اور ہمدردی میں جب کبھی تضادات پیدا ہوں تو ان میں سے کسی ایک کو مکمل طور پر دبانے کی بجائے اُن میں مصالحت کے ذریعے ان تضادات کو دور کرنا چاہیے۔ جبلت کی اپنی ایک اہمیت ہے اور اگر ہم اُسے ایک حد سے زیادہ دبائیں تو وہ پیچیدہ طریقوں سے بدلہ اُتار لیتی ہے۔ لہٰذا اچھی زندگی کی جستجو میں انسانی امکان کی حدود کو پیش نظر رکھنا لازم ہے۔ خیر یہاں ہم پھر علم کی ضرورت کے مسئلہ پر واپس آ گئے ہیں۔

جب میں اچھی زندگی کے ایک عنصر کی حیثیت سے علم کا ذکر کرتا ہوں تو اس سے میری مراد اخلاقی علم نہیں ہوتا۔ بلکہ میرا اشارہ سائنسی علم اور مخصوص حقائق کے علم کی طرف ہوتا ہے۔ میرے نزدیک حقیقی معنوں میں اخلاقی علم جیسی کوئی شے وجود نہیں رکھتی۔ جب ہم کسی مقصد کو حاصل کرنے کے خواہاں ہوتے ہیں تو علم اُس کے حصول کے ذرائع کو اجاگر کرسکتا ہے۔ سرسری طور پر اس علم کو ہم اخلاقی قرار دے سکتے ہیں۔ تاہم میں نہیں سمجھتا کہ ہم کس طرز عمل کے امکانی نتائج کو نظر انداز کر کے یہ طے کر سکتے ہیں کہ کون سا طرز عمل درست ہے اور کون سا غلط۔ جب کسی مطلوبہ مقصد کا تعین ہو جاتا ہے تو پھر سائنس ہی دریافت کرسکتی ہے کہ اس کے حصول کے لیے کون سا طرز عمل اختیار کیا جائے۔ جملہ اخلاقی اصولوں کا جائزہ اس حوالے لینا چاہیے کہ آیا وہ ہمارے مطلوبہ مقاصد کے حصول میں مدد دیتے ہیں جب یہ کہا جاتا ہے کہ ہمیں اور کس شے کی خواہش کرنی چاہیے۔'' تو اصل میں اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کس دوسرے فرد کے نزدیک ہمیں کیا خواہش کرنی چاہیے۔ عام طور پر اس کا مطلب یہ خواہش ہوتی ہیں جو بالاتر افراد جیسے والدین، استاد، پولیس مین اور جج صاحبان ہم پر ٹھونسنا چاہتے ہیں۔

جب آپ مجھ سے یہ کہتے ہیں کہ ''تمھیں فلاں فلاں کام کرنا چاہیے۔ تو آپ کی

بات کی قوت محرکہ میری اس خواہش میں مضمر ہوتی ہے کہ میں آپ کی پسندیدگی کا لحاظ کروں پھر یہ بھی کہ آپ کی پسندیدگی یا ناپسندیدگی کے ساتھ جزا و سزا بھی منسلک ہوسکتی ہے۔ چونکہ انسانی سرگرمیاں خواہش سے جنم لیتی ہیں، لہٰذا یہ امر واضح ہے کہ اخلاقی تصورات کی بس اتنی ہی اہمیت ہے جتنا کہ وہ ہماری خواہشوں کو متاثر کرتے ہیں۔ وہ یہ کام منظوری کی خواہش اور نامنظوری کے خوف کے ذریعے سرانجام دیتے ہیں۔ منظوری کی خواہش اور نامنظوری کا خوف طاقتور سماجی قوتیں ہیں۔ لہٰذا اگر ہم کوئی سماجی مقصد حاصل کرنا چاہتے ہیں تو پھر فطری طور پر ان قوتوں کو اپنے حق میں استعمال کرنا ہوگا۔

نظری اخلاقیات کا غیر ضروری ہونا سادہ مثالوں سے واضح ہو جاتا ہے۔ فرض کیجئے کہ کسی شخص کا بچہ بیمار ہے۔ محبت کی وجہ سے وہ بچے کی صحت چاہتا ہے اور سائنس اُسے علاج کا طریقہ بتاتی ہے ان دونوں باتوں کے درمیان ایسی اخلاقیات کے لیے کوئی گنجائش نہیں جہاں یہ بتایا جاسکے کہ بچے کا علاج کروانا اچھی بات ہے، بچے کے بیمار ہونے کی صورت میں آپ کا عمل ایک مقصد (یعنی بچے کی صحت یابی) سے پیدا ہوتا ہے اور اس کے ساتھ اس مقصد کو حاصل کرنے کے ذرائع کے علم کارفرما ہوتا ہے۔ یہی بات تمام اعمال کے بارے میں درست ہے چاہے وہ اچھے ہوں یا بُرے۔ مقاصد میں فرق ہوتا ہے اور یہ بھی ہے کہ بعض مقاصد کے حصول کے لیے درکار علم موجود ہوتا ہے اور بعض کے لیے نہیں۔ تاہم ایسا کوئی قابل تصور طریقہ موجود نہیں جس کے ذریعے لوگوں کو وہ کام کرنے پر مجبور کیا جائے جس کو کرنے کے وہ خواہش مند نہیں۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ جزا و سزا کے کسی نظام کے ذریعے لوگوں کی خواہشیں ہی بدل دی جائیں اور اس نئے نظام میں سماجی منظوری یا نامنظوری کی قوتیں ختم کر دی جائیں۔ یوں قانون ساز معلمین اخلاق کی توجہ کے لیے سوال یہ سامنے آتا ہے کہ سزا و جزا کا نظام کس طرح یوں ترتیب دیا جائے کہ قانونی اتھارٹی کی خواہش کی زیادہ سے زیادہ تکمیل کروائی جاسکے۔ اب اگر میں یہ کہوں کہ قانونی اتھارٹی کی خواہشیں بڑی ہیں تو اس سے میری مراد یہ ہوگی کہ اُس کی خواہشیں معاشرے کے اُس حصے کی خواہشوں سے متصادم نہیں جس سے میرا تعلق ہے۔ انسانی خواہشوں سے ماورا کوئی اخلاقی معیار وجود نہیں رکھتا۔

یوں ہم دیکھتے ہیں کہ کوئی خاص قسم کا علم نہیں بلکہ خواہش ہی اخلاقیات کو سائنس

سے ممیّز کرتی ہے۔ اخلاقیات میں بھی ویسا ہی علم درکار ہوتا ہے جیسا کہ علوم کے دوسرے شعبوں میں۔ جو شے اس سے مخصوص ہے وہ یہ ہے کہ بعض مقاصد کی خواہش کی جاتی ہے اور یہ کہ راست عمل ان کے لیے سازگار ہوتا ہے۔ بلاشبہ راست عمل کو وسیع پیمانے پر قابل قبول بنانے کے لیے ضروری ہے کہ مقاصد ایسے ہوں جو زیادہ سے زیادہ لوگوں کے لیے قابل قبول ہوں۔ راست عمل سے گزر کر اگر میں وہ عمل لوں جو میری آمدنی میں اضافے کا موجب ہو، تو پھر قارئین اس سے اتفاق نہ کریں گے۔ میرے استدلال کی قوت اُس کے سائنسی حصے میں مضمر ہے---یعنی اس ثبوت میں کہ کسی اور طرز عمل کے بجائے ایک خاص قسم کا طرز عمل ایک ایسے مقصد کے حصول کا وسیلہ ہے جس کی بڑے پیمانے پر آرزو کی جاتی ہے۔ تاہم میں اخلاقی استدلال اور اخلاقی تعلیم میں امتیاز کرتا ہوں۔ اخلاقی تعلیم کا تعلق بعض خواہشوں کو مضبوط کرنے اور بعض کو کمزور کرنے سے ہے۔ یہ اس سے بالکل مختلف عمل ہے۔ آگے چل کر ہم اس کو موضوع بحث بنالیں گے۔

اس ساری بحث کے بعد ہم زیادہ صراحت کے ساتھ اچھی زندگی کے مفہوم کی وضاحت کرسکتے ہیں۔ میں نے جب یہ کہا تھا کہ اچھی زندگی علم سے رہنمائی حاصل کرنے والی محبت پر مبنی ہوتی ہے تو اس کا مطلب یہ تھا کہ میں ممکنہ حد تک اس قسم کی زندگی بسر کرنا چاہتا ہوں اور دوسروں کو بھی ایسی ہی زندگی گزارتے دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس بیان کا منطقی مشتملہ یہ ہے کہ جس معاشرے میں لوگ اس قسم کی زندگی بسر کر رہے ہوں تو اُس میں ان معاشروں کے مقابلے میں لوگوں کی خواہشیں زیادہ پوری ہوں گی جن میں علم یا محبت کی کارفرمائی کم ہو البتہ میں یہ دعویٰ نہیں کروں گا کہ اس قسم کی زندگی پاکباز ہوتی ہے اور یہ کہ اس کے برعکس زندگی گناہ آلود ہوا کرتی ہے، وجہ یہ ہے کہ میرے نزدیک اس قسم کے تصورات کوئی سائنسی جواز نہیں رکھتے۔

اخلاقی اصول:

اخلاقی قواعد وضوابط کی عملی ضرورت خواہشات کے تصادم سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ تصادم مختلف لوگوں میں پیدا ہوسکتا ہے اور ایک شخص میں مختلف اوقات پر بلکہ ایک ہی وقت پر پیدا ہوسکتا ہے مثلاً کوئی شخص شراب بھی پینا چاہتا ہے اور یہ بھی چاہتا ہے صبح کو وہ کام

کے لیے چاق و چوبند بھی اُٹھے۔ اب اگر وہ ایسا طرزِ عمل اپناتا ہے جس سے اُس کی مجموعی خواہش کی بہت کم تسکین ہوتی ہے تو ہم اُسے بداخلاق خیال کریں گے۔ اس طرح ہم فضول خرچ اور غیر محتاط افراد کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھنی چاہے ان کے طرزِ عمل سے خود اُن کے سوا کسی اور کو نقصان نہ پہنچتا ہو۔ بینتھم کے نزدیک ہر قسم کے اخلاقی اصول وقواعد کو ''روشن خیال'' خودغرضی سے اخذ کیا جا سکتا ہے گویا اگر کوئی شخص ہمیشہ زیادہ سے زیادہ تسکین حاصل کرنے کے حوالے سے عمل کرتا ہے تو آخر کار وہ راست عمل ہوگا۔ میں اس نقطہ نظر کو قبول نہیں کر سکتا۔ ایسے کسی آمر گزرے ہیں جو لوگوں کو زخم لگا کر خوشی حاصل کرتے تھے۔ میں ایسے لوگوں کو پسند نہیں کر سکتا جو دانائی سے کام لیتے ہوئے محض اس لیے اپنے ستم رسیدوں کی جان بخش دیتے ہیں کہ اس طرح انہیں اذیت کا ایک اور دن مل جائے گا۔

بہرطور دانائی اچھی زندگی کا جزو ضرور ہے۔ یہاں تک کہ رابن سن کروسو کو بھی کبھی کبھار محنت، ضبطِ نفس اور بصیرت سے کام لینا پڑتا تھا۔ (یہ وہ خوبیاں ہیں جن کو لازماً اخلاقی صفات سمجھنا چاہیے) کیونکہ دوسروں کو پہنچائے جانے والے نقصان کا ازالہ کیے بغیر یوں اُسے حاصل ہونے والی تسکین بڑھ جاتی تھی۔ اس قسم کے اخلاقی قواعد ایسے چھوٹے بچوں کی تربیت میں اہم کردار ادا کرتے ہیں جو مستقبل کے بارے میں سوچنے کا کوئی میلان نہیں رکھتے لیکن بعد کی زندگی میں بھی ان پر زیادہ عمل کیا جائے تو یہ دنیا دیکھتے ہی دیکھتے جنت میں تبدیل ہو جائے۔ وجہ یہ ہے کہ اس طرح جنگوں کو روکنا ممکن ہو جائے گا۔ یہ بات تو ہم سب جانتے ہیں کہ جنگ فہم و دانائی کا نہیں بلکہ جذبے کا کام ہے۔ دانائی کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ تاہم وہ اخلاق کا سب سے دلچسپ جزو نہیں ہے۔ مزید برآں یہ ذہنی مسائل پیدا کرنے والا جزو بھی نہیں کیونکہ اس کی حد خودغرضی تک محدود رہتی ہے۔

اخلاقی ضوابط کا جو حصہ دانائی کی حد سے باہر ہے، اُس کی حیثیت قانون یا کسی کلب کے ضابطوں جیسی ہے۔ کہنا چاہیے کہ یہ اخلاقی ضابطے خواہشوں کے باہمی ٹکراؤ کے امکان کے باوجود انسانوں کو معاشرے میں مل جل کر رہنے کے قابل بنانے کا طریقہ ہے معاشرے میں ایک طرف تو فوجداری قانون ہوتا ہے جو دوسرے لوگوں کی خواہشوں میں بعض مخصوص طریقوں سے مزاحم ہونے والے اعمال کو قابل سزا قرار دے کر محض خارجی قسم

کی ہم آہنگی حاصل کرنا چاہتا ہے۔ یہ سماجی ملامت کا طریقہ بھی ہے۔ معاشرہ اگر کسی شخص کو بُرا سمجھے تو یہ بھی ایک قسم کی سزا ہے۔ اس سے بچنے کی خاطر اکثر لوگ سماجی ضابطوں کی خلاف ورزی کو چھپائے رکھتے ہیں۔ تاہم ایک اور طریقہ بھی ہے جو زیادہ بنیادی قسم کا ہے اور کامیاب ہونے کی صورت میں وہ زیادہ اطمینان بخش بھی ہوتا ہے۔ یہ طریقہ ہے دوسرے لوگوں کے کردار اور خواہشوں کو اس طرح تبدیل کر دینے کا کہ ایک شخص کی کامیابی دوسرے شخص کی خواہشوں سے امکانی حد تک ہم آہنگ ہو جائے اور یوں اُن میں تصادم کے مواقع کم سے کم ہو جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ محبت نفرت سے بہتر ہے، کیونکہ وہ متعلقہ افراد کی خواہشوں میں تصادم کی بجائے ہم آہنگی پیدا کرتی ہے۔ دو محبت کرنے والے افراد اکٹھے کامیاب ہوتے ہیں یا ناکام ہو جاتے ہیں۔ لیکن جب دو افراد ایک دوسرے سے نفرت کر رہے ہوں تو پھر ان میں سے ایک کی کامیابی دوسرے کی ناکامی بن جاتی ہے۔

اب اگر ہماری یہ بات درست ہے کہ اچھی زندگی محبت سے فیضان اور علم سے رہنمائی حاصل کرتی ہے تو پھر یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ کسی معاشرے کا ضابطہ اخلاق حتمی اور خود کفیل نہیں ہوا کرتا۔ اس کا جائزہ اس حوالے سے لینا لازم ہے کہ آیا وہ ایسا ضابطہ ہے جس کو دانش مندی اور ہمدردی کی تائید حاصل ہو۔ اخلاقی ضابطے ہمیشہ غلطیوں سے پاک نہیں ہوتے۔ چنانچہ ازتیک لوگ (AZTEC) انسانی گوشت کھانے کو ناگوار فرض سمجھ کر پورا کرتے تھے، کیونکہ انہیں ڈر تھا کہ اگر وہ انسانی گوشت نہ کھائیں گے تو سورج کی روشنی مدھم ہو جائے گی۔ گویا اپنی سائنس میں وہ غلطی پر تھے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ اگر انہیں قربانی کا بکرا بننے والوں سے کوئی محبت ہوتی تو انہیں اپنے علم کی اس غلطی کا احساس بھی ہو جاتا۔ بعض قبائل دس سے سترہ برس کی دوشیزاؤں کو سورج سے چھپا کر رکھتے ہیں انہیں ڈر ہوتا ہے کہ سورج کی شعائیں ان دوشیزاؤں کو حاملہ کر دیں گی۔ کیا ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے اخلاقی ضابطوں میں اس قسم کی حماقتیں شامل نہیں؟ کیا واقعی ہم ان باتوں سے منع کرتے ہیں جو حقیقتاً نقصان دہ ہیں یا کم از کم اتنی مکروہ ضرور ہیں کہ کوئی نفیس آدمی ان کی حمایت نہیں کر سکتا؟ میں تو ان سوالات کا پورے اعتماد کے ساتھ ''ہاں'' میں جواب نہیں دے سکتا۔

موجودہ اخلاق، افادیت پرستی اور توہم پرستی کا عجیب وغریب ملغوبہ ہے تاہم اس میں توہم پرستی کا عنصر حاوی ہے۔ یہ امر بالکل فطری ہے کیونکہ اخلاقی اصولوں کا منبع توہم پرستی ہی ہے۔ زمانہ قدیم میں سمجھا جاتا تھا کہ بعض افعال دیوتاؤں کو ناراض کرنے کا سبب بنتے ہیں لہٰذا قانون کے ذریعے ان کی ممانعت کی جاتی تھی کیونکہ یہ سمجھا جاتا تھا کہ دیوتا ناراض ہوئے تو وہ صرف گناہ گار افراد کو ہی نہیں بلکہ پورے کے پورے گروہوں کو سزا دیں گے۔ یوں گناہ کا یہ تصور پیدا ہوا کہ گناہ وہ کام ہے جو خدا کو پسند نہیں۔ اس امر کا کوئی سبب تلاش نہیں کیا جاسکتا کہ خدا کو بعض افعال کیوں پسند نہیں ہیں چونکہ مذہبی کتابوں میں بعض افعال کو گناہ قرار دیا گیا تھا لہٰذا انہیں ناپسند یہ قبول کرلیا گیا۔ کبھی کبھار خدائی احکام کی نرالی توجیہات کی جاتی رہی ہیں۔ مثلاً ایک خدائی حکم یہ ہے کہ ''سبت'' کے دن کوئی کام نہیں کرنا چاہیے۔ اس سے عیسائیوں کا پروٹسٹنٹ فرقہ یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ اتوار کے روز کھیل کود سے اجتناب کرنا چاہیے۔ وہ زمانے کب کے گزر گئے ہیں لیکن حالت یہ ہے کہ آج کے اخلاقی ضابطوں سے بھی ویسی ہی پُرجلال اتھارٹی منسوب کی جاتی ہے۔

یہ بات واضح ہے کہ زندگی سے متعلق سائنسی نقطہ نظر رکھنے والا کوئی شخص مذہبی کتب یا چرچ کی تعلیمات سے خوف زدہ نہیں ہوگا۔ اُس کا طرز فکر یہ نہ ہوگا کہ فلاں فلاں کام گناہ میں داخل ہے اور استدلال کی ضرورت نہیں، وہ یہ دیکھنے کی کوشش کرے گا کہ آیا وہ کام واقعی نقصان دہ ہے یا یہ کہ اُسے گناہ قرار دینے والا تصور خود ہی نقصان دہ ہے۔ وہ دیکھے گا کہ خاص طور پر جنس سے متعلق آج کے اخلاقی قواعد وضوابط میں بھی توہم پرستی اور ضعیف الاعتقادی کا بہت سا عنصر شامل ہے۔ وہ یہ بھی دیکھے گا کہ کم ازکم لوگوں کی طرح ہماری ضعیف الاعتقادی میں بھی غیر ضروری ظلم وستم شامل ہے اور اگر لوگ اپنے ہمسایوں کے بارے میں محبت اور ہمدردی کے جذبات رکھنے لگیں تو یہ ظلم ختم ہوسکتا ہے۔ لیکن معاملہ یہ ہے کہ روایتی اخلاق کے حامی اکثر اوقات پتھر دل لوگ ہوتے ہیں، ملاؤں کی جنگ جوئی اور سنگ دلی سے ہم اس حقیقت کو محسوس کرسکتے ہیں۔ ہم یہ سوچ سکتے ہیں کہ ان لوگوں کے نزدیک اخلاقی ضابطے اصل میں دوسروں کو رنج پہنچانے کا جائز وسیلہ ہیں۔ اس لیے وہ گناہ گاروں پر کسی لیت ولعل کے بغیر جھپٹ پڑتے ہیں۔

آیئے ہم مہد سے لحد تک ایک عام انسانی زندگی کا جائزہ لیں اور ان نکات کو

نوٹ کریں جہاں توہم پرست اخلاقی ضابطے غیر ضروری دکھ کا موجب بنتے ہیں۔ اچھا تو آیئے میں زندگی کی ابتدا یعنی حمل سے بات شروع کروں۔ ایسے مرحلے پر توہم پرستی کا اثر خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اب اگر بچے کے ماں باپ آپس میں شادی شدہ نہیں تو بچے کو شرمناک فرد یا کلنک سمجھا جاتا ہے۔ یہ بالکل غیر ضروری ردعمل ہے، کیونکہ بچے کا اس میں کوئی قصور نہیں کہ اُس کے ماں باپ آپس میں شادی شدہ ہیں یا نہیں۔ اگر ماں باپ میں سے کوئی ایک کسی جنسی بیماری میں مبتلا ہو تو وہ عموماً بچے کو بھی وراثت میں ملتی ہے۔ مالی وسائل کے مقابلے میں اگر والدین کے بچے پہلے ہی زیادہ ہوں تو پھر انہیں افلاس، کم غذائیت، ہجوم اور غالباً آپس میں مباشرت کا خدشہ بھی لاحق ہوگا۔ اس کے باوجود معلمین اخلاق اور مذہبی رہنماؤں کی بھاری اکثریت مانع حمل دواؤں کے ذریعے اس قسم کی بدبختی کو روکنے کی مخالفت کرتی ہے۔ ان لوگوں کو خوش کرنے کی خاطر ان لاکھوں انسانوں کو دکھ جھیلنے پڑتے ہیں جن کی پیدائش کو آسانی سے روکا جا سکتا تھا۔ اس کی وجہ محض یہ ہے کہ معلمین اخلاق اور مذہبی رہنماؤں کے نزدیک جنسی مباشرت صرف بچے پیدا کرنے کی غرض سے ہونی چاہیے، بصورت دیگر وہ حرام کاری ہے۔ ازتیک قبیلے کے ستم کا شکار ہونے والے افراد اچانک ہلاک کیے جاتے تھے اور ان کو کھا لیا جاتا تھا۔ ان نشانہ بننے والے افراد کے مقابلے میں اُس بچے کو کہیں زیادہ مصائب برداشت کرنے پڑتے ہیں جو غربت اور دکھ کے ماحول میں جنم لیتا ہے یا جو پیدائشی طور پر بھی کسی جنسی بیماری میں مبتلا ہوتا ہے۔ یہ وہ مصائب ہیں جن کے ذمے دار مذہب کے نام پر ملا، پادری اور سیاست دان بنتے ہیں۔ اگر ان کے دل میں بچوں کے لیے ذرا سی محبت یا رحم کا کوئی جذبہ ہوتا تو وہ اُس اخلاقی ضابطے سے ہرگز چمٹے نہ رہتے جو اس شیطانی ظلم اور بربریت کا ذمہ دار ہے۔

پیدائش کے وقت اور زندگی کے ابتدائی مہینوں میں ایک عام بچہ ضعیف الاعتقادی سے زیادہ معاشی اسباب کے ہاتھوں تکلیف اٹھاتا ہے جب خوشحال گھرانوں کی عورتیں بچے جنتی ہیں تو انہیں بہترین ڈاکٹر، بہترین نرسیں، بہترین خوراک، بہترین آرام اور بہترین ورزش دستیاب ہوتی ہے۔ محنت کش اور غریب طبقے کی عورتوں کو یہ آسائشیں حاصل نہیں ہوتیں اور اس وجہ سے اکثر اوقات اُن کے بچے مر جاتے ہیں، سرکاری حکام اور ادارے ماؤں کی دیکھ بھال پر شاذ و نادر ہی توجہ دیتے ہیں۔ بچوں کی دیکھ بھال اور

انہیں مناسب خوراک مہیا کرنے کے بجائے یہ حکام صاف ستھرے اور پُرسکون علاقوں میں شاندار رہائشی علاقے بنانے پر زیادہ توجہ دیتے ہیں، انہیں جاننا چاہیے کہ اس قسم کا طرزِ عمل اختیار کر کے وہ بہت سے بچوں کو جرم اور افلاس کے ہاتھوں موت کے سپرد کرتے ہیں۔ اس کے باوجود حکمرانوں کو ملاؤں کی اکثریت کی تائید حاصل رہتی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو سماجی ظلم اور بے انصافی کو توہم پرستی کا سہارا عطا کیے ہوئے ہیں۔

تعلیم کے تمام مراحل میں توہم پرستی کا اثر اکثر تباہ کن ثابت ہوتا ہے۔ بچوں کا ایک گروہ ایسا بھی ہوتا ہے۔ جسے غور و فکر کی عادت ہوتی ہے۔ ہماری تعلیم کا ایک مقصد اس عادت کو ختم کرنا ہے بچہ جب ناگوار سوال کرتا ہے تو اُس کا مذاق اڑایا جاتا ہے یا پھر سزا دی جاتی ہے۔ اس طرح اُسے زبان بند رکھنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ بچے میں خاص قسم کے اعتقادات پیدا کرنے کی خاطر اجتماعی جذبے کو بروئے کار لایا جاتا ہے۔ سرمایہ دار، جنگ پرست اور ملا بچوں کی تعلیم میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ان سب کی قوت کا دارومدار اس بات پر ہے کہ معاشرے میں تنقیدی سوچ معدوم رہے اور جذبات پرستی کا رواج قائم رہے۔ انسانی فطرت کی مدد سے ایسی تعلیم عام آدمی کے ان میلانات کو بڑھانے اور ان میں شدت پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔

اساتذہ کے انتخاب پر اثر انداز ہو کر بھی توہم پرستی تعلیم کو نقصان پہنچانے کا سبب بنتی ہے۔ معاشی اسباب کے حوالے سے اس بات پر اصرار کیا جاتا ہے کہ خاتون استاد کو شادی شدہ نہیں ہونا چاہیے اور اخلاقی اسباب کے حوالے سے اُسے شادی سے ماورا جنسی تعلقات نہیں رکھنے چاہیں۔ اس کے باوجود جس کسی نے غیر صحت مند نفسیات کا مطالعہ کرنے کی تکلیف گوارا کی ہے اُسے خوب معلوم ہے کہ زیادہ عرصے تک کنواری رہنا عام طور پر عورت کے لیے بے حد خطرناک ہوتا ہے۔ یوں سمجھئے کہ یہ عورت کے لیے اس قدر نقصان دہ بات ہے کہ کسی صحت مند معاشرے میں خاتون اساتذہ میں اس کی حوصلہ افزائی نہ کی جائے گی۔ خاتون اساتذہ پر جو پابندیاں لگائی جاتی ہیں اُس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حوصلہ مند اور مہم جو خواتین تدریس کے شعبے میں داخل ہونے سے انکار کرنے لگی ہیں۔ یہ سب کچھ توہم پرست رہبانیت کے بچے کھچے اثرات کا نتیجہ ہے۔

درمیانے اور بالائی طبقے کے مدرسوں میں صورت حال اس سے بھی زیادہ

خراب ہے ان مدرسوں میں عبادت گاہیں قائم ہیں اور اخلاقی اُمور کی دیکھ بھال مذہبی افراد کے سپرد ہے۔ اخلاق کے اساتذہ کی حیثیت سے یہ مذہبی افراد دو طریقوں سے کم و بیش لازماً ناکام ہو جاتے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ ایسے افعال کی مذمت کرتے ہیں جو ضرر رساں نہیں ہیں اور دوسرا یہ کہ وہ ایسے افعال کو نظر انداز کر دیتے ہیں جو بہت نقصان دہ ہوا کرتے ہیں۔ یہ سب مذہبی لوگ ان غیر شادی شدہ لوگوں کے درمیان جنسی تعلقات کو ناپسند کرتے ہیں جو ایک دوسرے کو پسند تو کرتے ہوں لیکن ابھی انہیں اس بات کا یقین نہ ہو کہ آیا وہ زندگی بھر کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ رہنے کے خواہش مند ہیں۔ یہ بھی ہے کہ اکثر مذہبی لوگ برتھ کنٹرول کی مذمت کرتے ہیں لیکن ان میں سے کوئی بھی اُس شوہر کو بُرا بھلا نہیں کہتا جو زیادہ بچے پیدا کر کے بیوی کی موت کا سبب بن جاتا ہے۔ میں ایک فیشن ایبل مذہبی شخص کو جانتا ہوں جس کی بیوی نے نو برس میں نو بچے پیدا کیے تھے۔ ڈاکٹروں نے اُسے تنبیہہ کی تھی کہ اگر اُس نے ایک اور بچہ جنا تو مر جائے گی لیکن اگلے ہی برس وہ پھر حاملہ ہوئی اور مر گئی۔ مگر کسی نے اُس کے شوہر کی مذمت نہ کی۔ گرجے سے اُس کو مسلسل آمدنی ہوتی رہتی اور اس نے ایک اور بیاہ رچا لیا۔ مذہبی لوگ جب تک ظلم کو نظر انداز کرتے رہیں گے اور معصوم مسرتوں کا گلا گھوٹنے پر تیار رہیں گے، تب تک نو جوانوں کے اخلاق کے محافظ کی حیثیت سے وہ صرف نقصان ہی پہنچا سکتے ہیں۔

تعلیم پر توہم پرستی کا ایک اور ناگوار اثر یہ ہے کہ نئی نسل کو جنسی حقائق کی تعلیم نہیں دی جاتی۔ سن بلوغت سے پہلے بچوں کو اہم جسمانی حقائق کا درس سادگی سے اور فطری انداز میں دینا چاہیے۔ اُس زمانے میں یہ حقائق جذبات نہیں بھڑکاتے پھر بلوغت کے زمانے میں ایک حقیقت پسندانہ جنسی اخلاقیات کے عناصر کا علم مہیا کرنا چاہیے۔ لڑکوں اور لڑکیوں کو یہ تعلیم دی جانی چاہیے کہ باہمی رغبت کے بغیر جنسی مباشرت کا کوئی جواز نہیں ہے۔ یہ بات مذہب کی تعلیم کے خلاف ہے۔ اُس کی تعلیم یہ ہے کہ جب تک عورت اور مرد شادی شدہ نہ ہوں اور مرد ایک اور بچے کا خواہش مند نہ ہو، اُسے مباشرت نہیں کرنی چاہیے۔ اگر بیوی کی رضا مندی شامل نہ ہو تو بھی چرچ مرد کو مباشرت کی اجازت دیتا ہے۔ تاہم میں یہ کہتا ہوں کہ لڑکوں اور لڑکیوں کو ایک دوسرے کی آزادی کا احترام کرنا سکنا چاہیے۔ انہیں یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ کوئی شے بھی ایک انسان کو دوسرے

انسانوں پر حقوق عطا نہیں کرتی اور یہ کہ حسد اور ملکیت کی خواہش محبت کی قاتل ہے۔ انہیں یہ درس دینے کی ضرورت بھی ہے کہ کسی فرد کو دنیا میں لانا، اُس کی پیدائش کا سبب بننا ایک سنجیدہ معاملہ ہے۔ لہٰذا یہ کام اُسی وقت کرنا چاہیے جب پیدا ہونے والے بچے کی صحت، سازگار ماحول اور والدین کی محبت کے اچھے امکانات موجود ہوں۔ ان باتوں کے ساتھ ساتھ نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو برتھ کنٹرول کے طریقوں کی تعلیم دینا بھی ضروری ہے تاکہ اس امر کو یقینی بنایا جاسکے کہ وہ بچے صرف اُس وقت پیدا کریں گے جب اُن کی ضرورت ہوگی۔ علاوہ ازیں انہیں جنسی بیماری اور اس کے علاج کے طریقوں کا علم بھی مہیا کیا جانا چاہیے۔ ان خطوط پر جنسی تعلیم سے انسانی مسرتوں میں بے پناہ اضافہ ہوسکتا ہے۔

اس حقیقت کو تسلیم کر لینا چاہیے کہ بچوں کی پیدائش کا خیال کیے بغیر جنسی تعلقات محض نجی معاملہ ہے۔ ریاست یا ہمسایوں کا اُن سے کوئی تعلق نہ ہونا چاہیے۔ جنس کی بعض صورتیں جو بچے کی پیدائش کا سبب نہیں بنتیں، فوجداری قانون کے تحت آج کل قابل سزا ہیں لیکن یہ بس توہم پرستی ہی ہے، کیونکہ اس معاملے سے جنسی کھیل میں شریک فریقین کے سوا کوئی اور شخص متاثر نہیں ہوتا۔ بچوں کی موجودگی کی صورت میں طلاق کو بہت زیادہ دشوار بنا دینے سے لازمی طور پر بچوں کو فائدہ نہیں پہنچتا۔ مسلسل بلانوشی، جفا کاری، یا جنون وہ بنیادیں ہیں جن کی بنا پر طلاق بچوں کے لیے اور بیوی یا شوہر کے لیے ضروری ہو جاتی ہے۔ اس کے مقابلے میں طلاق کے سلسلے میں بدکاری کو جو اہمیت دی جاتی ہے وہ سراسر غیر معقول ہے۔ اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ بدسلوکی کی بعض ورتیں کبھی کبھار کی بدکاری کے مقابلے میں ازدواجی مسرتوں کے لیے زیادہ نقصان دہ ہیں۔ اس سے نقصان دہ بات تو یہ ہے کہ مرد ہر سال ایک نئے بچے کے لیے اصرار کرے لیکن روایتی طور پر اس طرزِ عمل کو بُرا نہیں سمجھا جاتا۔

اخلاقی اصول ایسے نہیں ہونے چاہئیں جو جبلی مسرت کو محال بنادیں۔ جس معاشرے میں عورتوں اور مردوں کی تعداد میں بہت زیادہ فرق ہو وہاں یک زوجگی جبلی مسرتوں کے حصول میں بہت بڑی رکاوٹ بن جاتی ہے۔ بلاشبہ ان حالات میں اخلاقی اصولوں کی خلاف ورزی ہوتی ہے لیکن اگر اصول ایسے ہوں کہ جن کی پابندی معاشرے کی مسرتوں کو بڑی حد تک کم کر کے ہی ممکن ہو اور جب ان اصولوں کی پابندی سے اُن کی

خلاف ورزی بہتر ہو جائے تو ان اصولوں کو بدلنا ہی بہتر ہوتا ہے۔ اصولوں کو نہ بدلا جائے تو عوامی مفاد کے خلاف کام نہ کرنے والے لوگوں کو ریا کاری سے کام لینا پڑتا ہے یا پھر رسوائی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ چرچ اس ریا کاری کو بُرا نہیں سمجھتا لیکن دوسرے لوگ اب ریا کاری کو بُرا سمجھنے لگے ہیں۔

قوم پرستی والی تو ہم پرستی مذہبی تو ہم پرستی سے بھی زیادہ نقصان دہ ہے۔ تاہم میں یہاں اس مسئلے پر مفصل بحث کرنے کے بجائے محض یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہم جس محبت کو اچھی زندگی کا جزو خیال کرتے ہیں وہ صرف ہم وطنوں تک محدود نہیں رہتی۔ محبت کو اس حد میں مقید کرنا روشن خیال خود غرضی کے بھی خلاف ہے کیونکہ محدود قوم پرستی فاتح قوموں کے لیے بھی مفید ثابت نہیں ہوتی۔

مجرموں کے ساتھ ہم جس انداز میں پیش آتے ہیں اُس میں گناہ کے مذہبی اثرات دیکھے جا سکتے ہیں۔ عقلی اخلاقیات اس نظریے کی تائید نہیں کرسکتی کہ مجرم گناہ گار اور فاسق ہوتے ہیں اور سزا کے مستحق ہوتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ بعض لوگوں کے کرتوت ایسے ہوتے ہیں جن کو معاشرہ روکنا چاہتا ہے اور ممکنہ حد تک اُن کو روکنے کی کوشش کر کے معاشرہ اچھا قدم اُٹھاتا ہے۔ قتل کی مثال لے لیجیے۔ ظاہر ہے اگر معاشرہ اپنے وجود کو قائم رکھنا چاہتا ہے اور ہم اُس کی مسرتوں اور فائدوں سے بہرہ ور ہونا چاہتے ہیں تو پھر ہم لوگوں کو اس امر کی اجازت نہیں دے سکتے کہ جب اُن کا جی چاہے وہ ایک دوسرے کو قتل کرنے لگیں۔ تاہم اس مسئلے سے خالص سائنسی انداز میں نمٹنا چاہیے۔ ہمیں محض یہ سوال اٹھانا چاہیے کہ قتل کو روکنے کا بہترین طریقہ کیا ہے؟ قتل کو روکنے کے مؤثر ترین طریقے دو ہوں تو ہمیں ان میں سے اُس طریقے کو ترجیح دینی چاہیے جس میں قاتل کو کم سے کم نقصان پہنچتا ہو۔ ڈاکٹر کے آپریشن سے پیدا ہونے درد کی طرح قاتل کو پہنچنے والا نقصان بھی افسوسناک ہوتا ہے۔ اچھا، قاتل کو تکلیف پہنچانا ضروری تو ہوسکتا ہے، لیکن اس میں خوشی کی بات کوئی نہیں ہے۔ جس انتقامی جذبے کو ہم ''اخلاقی برہمی'' کا عنوان دیتے ہیں، وہ ظلم کی ایک صورت ہے۔ انتقامی سزا کے تصور کے ذریعے ہم کبھی مجرم کی ایذارسائی کو جائز ثابت نہیں کر سکتے، تعلیم اور رحم دلی مل کر اگر انتقامی سزا جتنی موثر ہوں تو پھر ہمیں تعلیم اور رحم دلی کو ترجیح دینی چاہیے، اور اگر وہ زیادہ موثر دکھائی دیں تو انہیں ترجیح بھی زیادہ دینی

چاہیے۔

جرم کی روک تھام اور جرم کی سزا دو مختلف مسائل ہیں۔ مجرم کو سزا جرائم کی روک تھام کے لیے دی جاتی ہے۔ جیلوں کی صورت حال انسانی تقاضوں کے مطابق ہو جائے تو وہاں معاوضے کے بغیر اچھی تعلیم ملنے لگے تو ہوسکتا ہے لوگ جیلوں میں داخل ہونے کے لیے جرائم کا ارتکاب کرنے لگیں۔ لہٰذا جیلوں کے حالات کو آزادی کے مقابلے میں کم خوش گوار ہونا چاہیے لیکن اس مسئلے کا حل یہ نہیں کہ ہم جیلوں کو ممکنہ حد تک عبرتناک بنا دیں بلکہ بہترین حل یہ ہے کہ ہم آزادی کو زیادہ خوش گوار اور مسرت انگیز بنائیں۔ بہرحال میں یہاں تعزیری اصلاح کے موضوع پر بحث کا ارادہ نہیں رکھتا۔ میں بس یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مجرم کے ساتھ ہمیں ویسا ہی سلوک کرنا چاہیے جیسا سلوک ہم طاعون کے مریض کے ساتھ کرتے ہیں۔ مجرم اور طاعون کا مرض دونوں عوام کے لیے خطرناک ہوتے ہیں۔ لہٰذا جب تک وہ خطرہ بنے رہیں، اُن کی آزادی کو محدود کرنا ضروری ہوتا ہے لیکن ہوتا یہ ہے کہ طاعون کے مریض کے ساتھ ہم ہمدردی اور غمگساری سے پیش آتے ہیں جب کہ مجرم سے نفرت کرتے ہیں۔ یہ غیر معقول انداز ہے۔ اس رویے کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے ہسپتال مریضوں کے علاج میں زیادہ کامیاب ہیں جب کہ ہماری جیلیں مجرمانہ رویوں کی روک تھام میں بُری طرح ناکام ہوگئی ہیں۔

انفرادی اور سماجی نجات:

روایتی مذہب کی ایک خامی اُس کی انفرادیت پسندی ہے اور یہ خامی روایتی مذہب سے وابستہ اخلاقی نظام میں بھی پائی جاتی ہے۔ روایتی طور پر مذہبی زندگی روح اور خدا کے درمیان ایک مکالمہ تھی۔ خدا کے ارادے کی اطاعت نیکی خیال کی جاتی تھی اور فرد معاشرے میں لاتعلق ہو کر نیکی حاصل کرسکتا تھا۔ پروٹسٹنٹ فرقوں نے ''نجات کی تلاش'' کے تصور کو فروغ دیا لیکن مسیحی تعلیمات میں نجات پہلے سے موجود تھی۔ تاریخ کے بعض ادوار میں جداگانہ فروغ دیا لیکن مسیحی تعلیمات میں نجات پہلے سے موجود تھی۔ تاریخ کے بعض ادوار میں جداگانہ روح کی اس انفرادیت پسندی کی اپنی قدر و قیمت تھی لیکن دنیائے جدید میں ہمیں فلاح کے انفرادی تصور کے بجائے اجتماعی تصور کی حاجت ہے۔ یہاں ہم

دیکھیں گے کہ اچھی زندگی کے ہمارے تصور کو یہ خیال کس طرح متاثر کرتا ہے۔

عیسائیت کا ظہور سلطنت روما کی اُن آبادیوں میں ہوا جو سیاسی قوت سے مکمل طور پر محروم تھیں اور جن کی قومی ریاستوں کو تباہ و برباد کر کے انہیں ایک وسیع و عریض غیر شخصی مجموعے میں ضم کر دیا گیا تھا۔ مسیحی عہد کی پہلی تین صدیوں کے دوران عیسائیت قبول کرنے والے لوگ ایسے سماجی اور سیاسی اداروں کے ماتحت زندگی گزارنے پر مجبور تھے جن کو وہ دل کی گہرائیوں سے بُرا سمجھتے تھے، لیکن اُن کو تبدیل کرنے کی قدرت نہ رکھتے تھے۔ اس قسم کے حالات میں اس یقین کا پیدا ہونا فطری امر تھا کہ فرد غیر کامل دنیا میں بھی کمال حاصل کرسکتا ہے اور یہ کہ اچھی زندگی کا اس دنیا سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کے برخلاف جب افلاطون نے اچھی زندگی کو بیان کرنا چاہا تھا تو اُس نے محض فرد کو ہی نہیں پورے گروہ کو پیش نظر رکھا تھا۔ اُس نے یہ نقطہ نظر انصاف کی وضاحت کے لیے اختیار کیا تھا جو کہ بنیادی طور پر ایک سماجی تصور ہے۔ وہ ایک جمہوریہ کی شہرت کا عادی تھا اور سیاسی ذمہ داری کا تصور اُس کے لئے بالکل فطری تھا۔ یونانی آزادی کے زوال پر رواقیت کو فروغ ملا جو عیسائیت کی طرح، لیکن افلاطون کے برخلاف، اچھی زندگی کے انفرادیت پسند تصور پر یقین رکھتی تھی۔

ہم لوگ جمہوری نظاموں میں زندگی گزار رہے ہیں لہٰذا ہمیں روم کے آمرانہ سامراج کے مقابلے میں آزاد ایتھنز میں زیادہ موزوں اخلاقیات دکھائی دینی چاہیے۔ ہندوستان میں چند برس پہلے تک حالات حضرت عیسیٰ کے زمانے کے شہر جوڈیا سے مختلف نہ تھے۔ اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ وہاں مہاتما گاندھی حضرت عیسیٰ سے ملتی جلتی اخلاقی اقدار کا چرچا کر رہے تھے لیکن ہندوستان کے زیادہ انتہا پسند قوم پرست انفرادی نجات سے زیادہ مطمئن نہ تھے۔ وہ قومی نجات کے طلب گار تھے۔ اس ضمن میں انہوں نے مغرب کی آزاد جمہوریتوں سے نقطہ نظر حاصل کیا تھا۔ میں بعض پہلوؤں کی نشاندہی کرنا چاہتا ہوں جن میں مسیحی اثرات کے باعث یہ نقطہ نظر فی الحال زیادہ جرأت مندانہ اور خود آگاہ نہیں بلکہ اُس میں انفرادی نجات میں ایمان کا شائبہ موجود ہے۔

جس انداز میں ہم اچھی زندگی کو دیکھتے ہیں، اُس کے لئے بہت سے سماجی حالات درکار ہیں اور ان حالات کی عدم موجودگی میں وہ زندگی وجود میں نہیں آسکتی۔

ابھی ہم نے کہا تھا کہ اچھی زندگی محبت سے فیضان حاصل کرتی ہے اور علم سے رہنمائی۔ مطلوبہ علم صرف اُس وقت حاصل ہوسکتا ہے کہ جب حکومتیں اور اہل زر علم کی دریافت اور اشاعت میں دلچسپی لیں۔ مثال کے طور پر سرطان کی بیماری خطرناک انداز میں پھیل رہی ہے--- ہم اس بارے میں کیا کر سکتے ہیں؟ علم کی کمی کے سبب کوئی شخص بھی فی الحال اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا۔ اب جہاں تک علم کا تعلق ہے وہ تحقیق کے ذریعے ہی حاصل ہوسکتا ہے اور اس کے لیے رقوم کی ضرورت ہوتی ہے۔ مزید برآں سائنس، تاریخ، ادب اور آرٹ کا علم ہر خواہش مند کے لئے قابل حصول ہونا چاہیے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ حکام وسیع پیمانے پر انتظامات کریں۔ مذہبی طور طریقوں سے یہ مسئلہ حل نہیں ہوسکتا۔

اسی طرح بیرونی تجارت کا مسئلہ ہے جس کے بغیر برطانیہ کی آدھی آبادی بھوکی مرنے لگے گی۔ جب کھانے کو روٹی نصیب نہ ہوتو ہم میں سے چندلوگ ہی اچھی زندگی بسر کرسکیں گے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی مثالوں کا ڈھیر لگانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ کہنے کی اصل بات یہ ہے کہ یہ دنیا ایک وحدت ہے اور جو شخص اپنے طور پر آزادانہ زندگی بسر کرنے کا مدعی ہے، وہ شعوری لاشعوری طور پر طفیلی ہے۔

انفرادی نجات کے تصور سے ابتدائی دور کے مسیحی اپنی سیاسی غلامی کی تسکین کیا کرتے تھے۔ جونہی ہم اچھی زندگی کے بے تنگ تصور کی حدود سے نکلتے ہیں تو یہ تصور محال ہو جاتا ہے۔ راسخ العقیدہ مسیحی تصور کے مطابق اچھی زندگی سے مراد نیک زندگی ہے اور نیکی کا مطلب خدا کے حکم کی تعمیل ہے اور خدا ہر فرد کو اس کے ضمیر کے ذریعے اپنے حکم سے آگاہ کرتا ہے۔ یہ سارا تصور ہی ان لوگوں کا ہے جو کسی اجنبی آمریت کے پنجے میں جکڑے ہوئے ہیں۔ اچھی زندگی محض نیک زندگی نہیں، نیکی کے علاوہ اُس میں اور کئی چیزوں، مثلاً ذہانت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب جہاں تک ضمیر کا تعلق ہے وہ قابل اعتبار رہنما نہیں، کیونکہ ضمیر ابتدائے شباب میں سُنی ہوئی پند ونصائح کی مبہم یادوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس لئے کسی شخص کا ضمیر اُس کی نرس یا ماں سے زیادہ دانا کبھی نہیں ہوتا۔

صحیح معنوں میں اچھی زندگی بسر کرنے کے لئے آدمی کو اچھی تعلیم، دوستوں، محبت، بچوں (بشرطیکہ اُسے ان کی خواہش ہو) معقول آمدنی (تاکہ وہ تنگ دستی اور شدید پریشانیوں سے محفوظ رہے)، اچھی صحت اور دلچسپ کام کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ تمام اشیا

کسی نہ کسی حد تک معاشرے پر انحصار رکھتی ہیں اور سیاسی واقعات ان پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اچھی زندگی اچھے معاشرے میں ہی بسر ہو سکتی ہے۔ اچھا معاشرہ میسر نہ ہو تو پھر اچھی زندگی کو پورے طور پر حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

یہ اشرافی آدرش کی بنیادی خامی ہے۔ آرٹ، سائنس اور دوستی جیسی بعض چیزیں اشرافی معاشرے میں خوب پھل پھول سکتی ہیں۔ یونان میں غلامی کے نظام کے باعث وہ موجود تھیں جب کہ برطانیہ میں وہ استحصال کے سبب وجود رکھتی ہیں۔ لیکن اشرافی معاشرے میں ہمدردی آزادی سے فروغ نہیں پا سکتی۔ جاگیردار اپنے آپ کو یہ یقین دلانے پر مجبور ہوتا ہے کہ غلام، مزدور یا رنگ دار آدمی گھٹیا قسم کی مٹی سے بنا ہوا ہے اور اُس کے دکھوں اور مصیبتوں کی کوئی اہمیت نہیں۔ برطانوی نوآبادیوں میں انگریز شرفا کالوں کو اس بُری طرح پیٹتے ہیں کہ ناقابل بیان اذیت کے چند گھنٹوں کے بعد وہ دم توڑ دیتے ہیں۔ اب اگر یہ انگریز شرفا اعلیٰ تعلیم یافتہ، مہذب اور گفتگو کے ماہر ہوں تو بھی میں یہ تسلیم نہیں کر سکتا کہ وہ اچھی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ انسانی فطرت ہمدردی کی بعض حدود کا تعین کرتی ہے، لیکن اس قدر نہیں، جمہوری رویہ رکھنے والے معاشرے میں صرف کوئی دیوانہ ہی اس قسم کا سلوک کر سکتا ہے۔ اشرافی آدرش میں شامل ہمدردی کی حدود اُس کی علامت ہے۔ نجات ایک اشرافی آدرش ہے کیونکہ یہ انفرادیت پسندانہ ہے۔ اس وجہ سے بھی انفرادی نجات کے تصور کی آپ جو بھی تعبیر کریں اور جتنی بھی اُسے وسعت عطا کریں، وہ اچھی زندگی کی تعریف میں کام نہیں آ سکتا۔

نجات کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ وہ ناگہانی تبدیلی سے بھی حاصل ہو جاتی ہے۔ جیسے سینٹ پال کی طرف سے عیسائیت قبول کر لینا۔ شیلے کی نظمیں معاشرے پر اس تصور کے اطلاق کی مثال فراہم کرتی ہیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ شاعر ایک غیر اہم شخص ہوتا ہے جس کے خیالات کوئی اہمیت نہیں رکھتے لیکن میرے نزدیک انقلابی رہنماؤں کی بڑی تعداد شیلے سے ملتے جلتے خیالات کی حامل رہی ہے۔ یہ لیڈر خیال کرتے رہے ہیں کہ دکھ، ظلم اور گراوٹ کا سبب آمر، پادری اور سرمایہ دار ہیں اور یہ کہ اگر بدی کے ان منابع پر قابو پا لیا جائے تو دلوں میں بھی ایک عام تبدیلی پیدا ہو جائے گی اور انسان ہنسی خوشی زندگی بسر کرنے لگیں گے۔ اس قسم کے خیالات کے سبب انقلابی لیڈر ''جنگ کے خاتمے کے لئے

جنگ کرنے'' پر آمادہ رہے ہیں۔ اس جدوجہد میں ناکام رہنے والے یا پھر جانیں قربان کرنے والے انقلابی نسبتاً خوش نصیب رہے ہیں کیونکہ بدقسمتی سے جو انقلابی کامیاب ہو جاتے ہیں انہیں اپنے خوابوں کے ٹوٹنے کی اذیت سے گزرنا پڑتا ہے۔

میں یہ کہنے کی کوئی خواہش نہیں رکھتا کہ انقلاب کبھی بھی ضروری نہیں ہوتے لیکن میں یہ ضرور کہتا ہوں کہ امن اور خوشی کی دنیا تک جانے کے آسان راستے موجود نہیں ہیں۔ اسی طرح انفرادی یا اجتماعی اچھی زندگی تک رسائی کے لیے بھی آسان راہیں موجود نہیں ہیں۔ اچھی زندگی تک رسائی کے لیے ہمیں ذہانت، ضبط نفس اور ہمدردی کو فروغ دینے کی ضرورت ہے۔ یہ ایک کمیتی معاملہ ہے، بتدریج ترقی، ابتدائی تربیت اور تعلیمی تجربے کا معاملہ ہے۔ بے صبری ہی اچانک ترقی کے امکان میں یقین پیدا کرتی ہے۔ ممکنہ بتدریج ترقی اور اُس کے حصول کے طریقے مستقبل کی سائنس کا معاملہ ہیں البتہ اس وقت بھی کچھ نہ کچھ تو کہا جا سکتا ہے لہٰذا میں اس مضمون کے آخری حصے میں اس پر کچھ کہنے کی کوشش کروں گا۔

سائنس اور مسرت:

معلم اخلاق کا مقصد انسانوں کے کردار کو بہتر بنانا ہوتا ہے۔ یہ قابل تعریف خواہش ہے، کیونکہ اکثر اوقات انسانوں کا کردار افسوسناک ہوتا ہے۔ تاہم میں معلم اخلاق کی تعریف اس کے مقاصد یا ان مقاصد کے حصول کے لیے اختیار کیے جانے والے طریقوں کے سبب نہیں کر سکتا۔ اُس کا ظاہری طریقہ اخلاقی نصیحت ہے اور اگر وہ راسخ العقیدہ ہے تو اُس کا حقیقی طریقہ کار معاشی جزا و سزا کا ایک نظام ہے۔ اخلاقی پند و وعظ سے کوئی مستقبل یا قابل ذکر نتیجہ پیدا نہیں ہوتا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اجیا پسندوں کے اثرات بہت ہی عارضی ثابت ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر وہ کسی مرد کو مجبور کر سکتے ہیں کہ وہ نیم مستقل داشتہ رکھنے کی بجائے وقتی طوائف پر قناعت کرے، کیونکہ اُس کے لئے ایسا طریقہ اختیار کرنا ضروری ہے جس کو سب سے زیادہ آسانی کے ساتھ چھپایا جا سکے۔ اس طرح طوائفوں کو فائدہ پہنچا ہے اور وہ جنسی امراض پھیلانے لگی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ وہ نتیجہ نہیں جو معلم اخلاق چاہتا ہے لیکن اس کا ذہن اس قدر غیر سائنسی ہے کہ وہ دیکھ ہی نہیں

سکتا کہ اس کی کوششیں کیا پھل لا رہی ہیں۔

کیا کوئی ایسی بہتر شے ہے جو پند و وعظ اور رشوت کے اس غیر سائنسی آمیزہ کی جگہ لے سکے؟ میرے خیال میں ایسی شے موجود ہے۔

انسانوں کے افعال جہالت یا بڑی خواہشوں کے سبب نقصان دہ ہوتے ہیں۔ جب ہم سماجی نقطہ نظر سے بڑی خواہشوں کا ذکر کرتے ہیں تو اس سے مراد ایسی خواہش ہو سکتی ہیں جو دوسروں کی خواہشوں کی راہ روکتی ہے۔ زیادہ صراحت سے یوں کہیے کہ بڑی خواہشوں سے مراد ایسی خواہشیں ہیں جو زیادہ خواہشوں کی مزاحمت کرتی ہیں اور کم خواہشوں کی مددگار ہوتی ہیں۔ جہالت سے پیدا ہونے والے مضر اثرات پر تفصیل سے بات کرنا ضروری نہیں۔ یہاں ہم زیادہ علم کی وکالت کر رہے ہیں کیونکہ ترقی کی راہ زیادہ تحقیق اور زیادہ تعلیم سے نکلتی ہے، البتہ بڑی خواہشوں کے نتیجے میں پیدا ہونے والا نقصان زیادہ مشکل مسئلہ ہے۔

عام عورتوں اور مردوں میں ایک خاص حد تک فعال بدخواہی موجود ہوتی ہے۔ اس کا رخ خاص دشمنوں اور دوسروں کی تکلیف سے خوش ہونے کی طرف ہوتا ہے۔ اس پر عموماً اچھے اچھے جملوں کا پردہ ڈال دیا جاتا ہے۔ تقریباً آدھی روایتی اخلاقیات اس پردے کا کام دیتی ہے لیکن اگر مصلحین ہمارے کردار میں بھلائی پیدا کرنے کے مقصد میں کامیاب ہونا چاہتے ہیں تو پھر اس پوشیدہ بدخواہی کے وجود کو تسلیم کرنا ہوگا۔ اس کا اظہار ہزاروں انداز میں ہوتا ہے۔ لوگ جس خوشی سے سکینڈل دہراتے ہیں یا ان پر یقین کرتے ہیں، اُس میں اس بدخواہی کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔ اس جھلک کو مجرموں کے ساتھ بے رحم سلوک میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ حالانکہ بے رحم سلوک کرنے والوں کو معمول ہوتا ہے کہ اگر مجرموں سے بہتر سلوک کیا جائے تو اُن کی اصلاح ہو سکتی ہے۔ اس طرح کالوں کے ساتھ گوروں کے برتاؤ میں بھی اس انسانی بدخواہی کو کارفرما دیکھا جا سکتا ہے۔ یہاں تک کہ بچوں کو بھی خواہ مخواہ کے ظلم کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ افسانوی کردار کو پر فیلڈ اور راولیور ٹوسٹ محض تخیل کی پیداوار نہیں ہیں۔ یہ فعال بدخواہی انسانی فطرت کا بدترین عنصر ہے اور دنیا کو زیادہ خوش باش بنانے کے لیے اس عنصر کو بدلنا بے حد ضروری ہے۔ غالباً یہ بدخواہی تمام معاشی اور سیاسی اسباب سے زیادہ جنگوں کا سبب رہی ہے۔

اچھا تو آیئے ہم دیکھتے ہیں کہ بدخواہی کے اس مسئلے سے ہم کس طرح نمٹ سکتے ہیں۔ پہلے ہم اس کے اسباب سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ میرے خیال میں یہ اسباب جزوی طور پر سماجی اور جزوی طور پر نفسیاتی ہیں۔ پہلے ادوار کی طرح آج کی دنیا کی اساس بھی زندگی اور موت کی مسابقت پر ہے۔ چنانچہ دوسری جنگ عظیم میں ہم دیکھتے ہیں کہ مسئلہ یہ تھا کہ آیا جرمنوں کے بچے بھوک اور احتیاج سے مرنے چاہئیں یا اتحادیوں کے؟ (مانا کے طرفین بدخواہی پر اترے ہوئے تھے پھر بھی اس امر کا کوئی معمولی سا سبب بھی موجود نہ تھا کہ وہ زندہ کیوں نہ رہیں) اکثر لوگوں کے ذہنوں میں تباہی کا خوف موجود رہتا ہے۔ خاص طور پر صاحب اولاد لوگ اس خوف میں مبتلا رہتے ہیں۔ امیروں کو دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کمیونسٹ ان کے مال و متاع پر قابض ہو جائیں گے۔ غریبوں کو اپنی نوکریوں کا یا پھر صحت کا ڈر رہتا ہے۔ ہر کوئی دیوانہ وار تحفظ کا متلاشی ہے اور سمجھتا ہے کہ امکانی دشمنوں کو قابو میں رکھ کر اُسے تحفظ مل سکتا ہے۔ افراتفری کے عالم میں ظلم وسفا کی کا چلن عام ہو جاتا ہے اور بدترین بھی۔ ہر جگہ رجعت پسند خوف پھیلاتے رہتے ہیں۔ برطانیہ میں کمیونزم کا، فرانس میں جرمنوں کا اور جرمنی میں فرانس کا خوف عام کرتے رہتے ہیں۔ ان کی کوششوں کا واحد نتیجہ یہ ہے کہ جس شے سے وہ تحفظ چاہتے ہیں، اس کے خلاف خطرہ بڑھتا جاتا ہے۔

اس صورت حال میں سائنسی معلم اخلاق کو خوف سے نمٹنے پر زیادہ توجہ دینا چاہیے۔ یہ کام دو طریقوں سے ہوسکتا ہے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ تحفظ وسلامتی میں اضافہ کیا جائے اور دوسرا یہ کہ جرأت پیدا کی جائے۔ یاد رہے کہ یہاں خوف سے میری مراد کسی ممکنہ بدقسمتی کی معقول پیش بینی نہیں غیر معقول جذبے کی حیثیت سے خوف ہے۔ مثلاً جب کسی تھیٹر میں آگ لگ جاتی ہے تو کوئی معقول شخص بھی اُسی طرح خطرے سے آگاہ ہو جاتا ہے جس طرح افراتفری کا شکار ہو جانے والا کوئی اور شخص۔ لیکن اس صورت حال میں معقول شخص ایسے طریقے اختیار کرتا ہے جن کی مدد سے اس مصیبت پر قابو پایا جا سکے۔ جب کہ دوسرا شخص افراتفری کے عالم میں مصیبت میں اضافے کا سبب بن جاتا ہے۔ ترقی اور خوش حالی کے لئے خوف کے بجائے امید کی ضرورت ہوتی ہے۔ وکٹورین زمانے میں برطانیہ میں اس لئے تیزی سے ترقی ہوئی کہ لوگ خوف کے بجائے امید کا دامن تھامے

ہوئے تھے۔ اب اگر ہمیں دوبارہ ترقی کرنی ہے تو پھر سے امید سے ناطہ جوڑنا ہوگا۔

عمومی تحفظ میں اضافہ کرنے والی ہر شے تشدد کم کرنے میں مددگار ہوسکتی ہے، جنگوں کی روک تھام بھی اس طریقے سے ممکن ہے۔ افلاس و محتاجی کی روک تھام میں بھی ہم اس طریقے سے کام لے سکتے ہیں۔ طب اور صحت و صفائی کے امور میں ترقی کے ذریعے صحت عامہ کا معیار بلند کیا جاسکتا ہے۔ اصل میں ان تمام دہشتوں کو کم کیا جاسکتا ہے جو ہمیں خوف میں مبتلا رکھتی ہیں اور زندگی میں ہمیں سکھ کا سانس نہیں لینے دیتیں لیکن اگر نسل انسانی کے ایک حصے کی قیمت پر دوسرے حصے کو تحفظ و سلامتی مہیا کرنے کی کوشش کی جائے تو اس سے اچھے نتائج پیدا نہیں ہوسکتے۔ ہم جرمنوں کی قیمت پر فرانسیسیوں کو، محنت کشوں کے کاندھوں پر سرمایہ داروں کو اور زرد نسل کی قیمت پر سفید فام نسل کو سلامتی مہیا نہیں کرسکتے۔ اس قسم کی کاوشوں سے الٹ نتائج پیدا ہوتے ہیں اور غالب گروہ میں خوف و دہشت بڑھ جاتی ہے، کیونکہ اُسے زیردستوں کی طرف سے بغاوت کا دھڑکا لگا رہتا ہے۔ گویا تحفظ صرف انصاف کے ذریعے مل سکتا ہے اور انصاف سے میری مراد تمام انسانوں کے مساوی حقوق کو تسلیم کرنا ہے۔

خوف کے خاتمے کے لیے درکار سماجی تبدیلیوں کے علاوہ خوف کے خاتمے کا ایک اور براہ راست طریقہ بھی ہے اور وہ ہے جرأت و حوصلے میں اضافے کا طریقہ۔ جنگوں میں چونکہ جرأت کی بہت ضرورت ہوتی ہے، لہٰذا ابتدائی زمانے ہی میں تعلیم اور خوراک کے ذریعہ جرات مندی میں اضافے کے طریقے دریافت کرلئے گئے تھے۔ مثلاً پرانے زمانے میں سمجھا جاتا تھا کہ انسانی گوشت کھانے سے جرأت بڑھ جاتی ہے۔ تاہم فوجی جرأت صرف حکمران طبقے کا استحقاق تھی۔ چنانچہ قدیم یونان میں سپارٹا کے آزاد سپاہیوں کو غلام سپاہیوں کے مقابلے میں زیادہ جری سمجھا جاتا تھا۔ برطانوی ہند کی فوج میں انگریز سپاہیوں کو دیسی سپاہیوں کے مقابلے میں زیادہ جرأت مند خیال کیا جاتا تھا۔ اس طرح عورتوں کے مقابلے میں مردوں کو بہادر تصور کیا جاتا ہے۔ اس صورت حال میں ہوتا یہ ہے کہ حکمران طبقے کی جرأت میں ہر اضافے کو زیردستوں کا بوجھ بڑھانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ گویا اس سے حاکموں کا خوف بھی بڑھ جاتا ہے، ظلم اور بے رحمی کے اسباب اپنی جگہ موجود رہتے ہیں۔ انسانوں کو شائستہ اور شفیق بنانے کے لیے جرأت مندی

کو جمہوری رنگی دینا ضروری ہے۔

یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ حالیہ واقعات نے پہلے ہی جرأت مندی کو خاصی حد تک عام کر دیا ہے۔ مثلاً حق رائے دہی طلب کرنے والی عورتوں نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ جرأت مندی میں بہادر ترین مردوں سے پیچھے نہیں۔ رائے دہی کا حق حاصل کرنے کے لئے جرأت مندی کا یہ مظاہرہ ضروری تھا۔ دوسری جنگ عظیم کی صورت حال یہ تھی کہ اُس میں سپاہی کو کیپٹن یا لیفٹیننٹ سے زیادہ اور جنرل سے تو کہیں زیادہ جرأت کی ضرورت تھی۔ جن کمیونسٹوں نے روس میں انقلاب برپا کیا، اُن کے بارے میں آپ جو بھی کہیں لیکن انہیں بزدل نہیں کہا جاسکتا۔ انقلاب سے پہلے کا ریکارڈ دیکھتے ہیں کہ گزشتہ نصف صدی کے دوران ایسے کئی واقعات رونما ہوئے ہیں جنہوں نے ثابت کر دیا ہے کہ ماضی کی طرح اب جرأت مندی پر اشرافیہ کی اجارہ داری نہیں رہی۔

لڑائی جھگڑے میں جس جرأت کا اظہار ہوتا ہے وہ جرأت مندی کی واحد صورت نہیں، شاید اُسے اہم ترین صورت بھی قرار نہیں دیا جاسکتا۔ غربت کا مقابلہ کرنے، تمسخر کا مقابلہ کرنے اور اپنے ہی گروہ کی طرف سے مخالفت کا سامنا کرنے میں بھی جرأت مندی ہوتی ہے۔ یہ ایسے میدان ہیں جن میں دلیر ترین سپاہی بھی اکثر اوقات افسوسناک حد تک بزدل ثابت ہوتے ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ خطرے کی حالت میں ٹھنڈے دل اور عقل وفہم سے کام لینا اور افراتفری اور ہیجان کی ترنگوں پر قابو رکھنا بھی جرأت مندی کا تقاضا کرتا ہے۔ بلاشبہ یہ ایسے امور ہیں جن میں تعلیم سے مدد لی جاسکتی ہے۔ اب اگر صحت اچھی ہو، جسم تندرست ہو، مناسب خوراک میسر ہو اور بنیادی حیاتی جبلتوں کو اظہار کے آزادانہ مواقع میسر ہوں تو پھر جرأت مندی کی ہر صورت کا درس دینا زیادہ آسان ہو جاتا ہے۔ جرأت کے جسمانی وسائل کو غالباً یوں بھی دریافت کیا جاسکتا ہے کہ کسی خرگوش کے خوف کا مقابلہ بلی کے خوف سے کیا جائے۔ اس میں شبہ نہیں ہونا چاہیے کہ سائنس جرأت مندی میں اضافے کے سلسلے میں بہت مددگار ثابت ہوسکتی ہے۔ اس کے لئے جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ (جیسے اچھی خوراک، اچھی صحت، ایڈونچر، کھیل وغیرہ) وہ بالائی طبقے کے نوجوانوں کو خاصی حد تک حاصل ہوتی ہیں۔ غریب لوگ ان سے محروم ہوتے ہیں، لیکن ضرورت ان کو بھی حوصلہ اور شکتی عطا کر دیتی ہے۔ تاہم

غریب طبقوں کے نوجوان پیش قدمی اور قیادت کے لئے درکار حوصلے عموماً محروم رہ جاتے ہیں۔ اگر وہ صفات عام ہو جائیں جو قیادت کے لئے ضروری سمجھی جاتی ہیں تو پھر قائد اور مقلد نہ رہیں گے اور جمہوریت کی تکمیل ہو جائے گی۔

خیر، اس حقیقت کی نشاندہی بھی ضروری ہے کہ بدخواہی صرف خوف سے پیدا نہیں ہوتی۔ بدخواہی پیدا کرنے میں حسد اور مایوسی کا بھی ہاتھ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اپاہج لوگوں میں عموماً بدخواہی کا عنصر زیادہ ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر کسی عورت یا مرد کو جنسی طور پر غیر مطمئن رکھا جائے تو اس میں حسد کا جذبہ بڑھ جاتا ہے۔ عموماً اس کا انداز یہ ہوتا ہے کہ متعلقہ فرد زیادہ خوش قسمت لوگوں پر اخلاقی حوالہ سے نکتہ چینی کرنے لگتا ہے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ انقلابی تحریکوں کی زیادہ تر قوت محرکہ امرا کے خلاف حسد سے پیدا ہوتی ہے۔ رقابت حسد کی ایک خاص صورت ہے جو محبت کے معاملے میں پیدا ہوتی ہے۔ عمر رسیدہ لوگ عموماً نوجوانوں سے حسد کرتے ہیں۔ اس صورت میں وہ نوجوانوں کے ساتھ بے رحمی سے پیش آنے لگتے ہیں۔

جہاں تک مجھے معلوم ہے، حسد سے نمٹنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ ہے کہ حاسد لوگوں کی زندگی کو زیادہ خوش گوار اور بھرپور بنایا جائے اور نوجوانوں کو مسابقت کے بجائے مشترکہ مہم جوئی کا درس دیا جائے۔ بدترین قسم کا حسد ان لوگوں میں پایا جاتا ہے جو شادی، بچوں یا کیریئر کے معاملے میں کامیابیاں حاصل کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔ بہتر سماجی اداروں کی صورت میں ان بدقسمتیوں سے محفوظ رہا جا سکتا ہے۔ خیر اس کے باوجود حسد کا کوئی نہ کوئی عنصر باقی رہ ہی جائے گا۔ تاریخ میں ایک دوسرے کے ساتھ حسد کرنے والے ایسے جرنیلوں کی کئی مثالیں ملتی ہیں جنہوں نے دوسرے کی شہرت داغدار کرنے کی خاطر شکست کو گلے لگا لیا۔ ایک ہی پارٹی کے دو سیاست دانوں یا ایک ہی سکول کے دو فن کاروں میں ایک دوسرے کے خلاف حسد کا پیدا ہونا کم و بیش یقینی امر ہے۔ ان صورتوں میں اس کے سوا اور کیا کیا جا سکتا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو حریفوں کو ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے سے دور رکھا جائے اور ایسا انتظام کیا جائے کہ وہ صرف بہتر صلاحیت کی بنا پر جیت سکیں۔ ایک فن کار کا دوسرے فن کار سے حسد عموماً کم نقصان دہ ہوتا ہے، کیونکہ اس کے حوالے سے فن کار کو اپنے حریف سے بہتر فن کارانہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کرنا پڑتا

ہے۔ جہاں کہیں حسد سے چھٹکارا ممکن نہ ہو، وہاں اسے حریفوں کی کاوشوں کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرنے کے بجائے اپنی صلاحیتوں کونکھارنے کے لئے استعمال کرنا چاہیے۔

انسانی مسرتوں میں اضافہ کرنے سے متعلق سائنس کے امکانات انسانی فطرت کے ان پہلوؤں کوختم کرنے تک محدود نہیں جوانسانوں کی راہ میں رکاوٹ بنتے ہیں اوراس لئے ہم انہیں ''برا'' قرار دیتے ہیں۔مثبت فضیلت کو بڑھانے میں سائنس غالباً لامحدود کردار ادا کرسکتی ہے۔اُس نے پہلے ہی صحت کی صورت حال کو بڑی حد تک بہتر بنا دیا ہے۔ ماضی پرستوں کے مرثیوں کے باوجود اب ہم زیادہ عرصے تک زندہ رہتے ہیں اور ماضی کے مقابلے میں اب بیماریاں بھی کم ہوگئی ہیں۔ جوعلم ہمارے پاس موجود ہے، اس کے کسی قدر زیادہ اطلاق کی صورت میں ہماری صحت مزید اچھی ہوسکتی ہے۔ ہم یقین کرسکتے ہیں کہ مستقبل کی دریافتیں اس عمل کی رفتار بہت تیز کردیں گی۔

اب تک طبعی سائنس نے ہماری زندگیوں کو زیادہ متاثر کیا ہے۔تاہم آئندہ علم اعضا اورنفسیات غالباً زیادہ اثر انگیز ثابت ہوں گی۔ جب ہم اس حقیقت کو دریافت کرلیں گے کہ انسانی کردار عضویاتی کیفیات پر کس طرح منحصر ہوتا ہے تو پھر ہم زیادہ تعداد میں ایسے لوگ پیدا کرسکیں گے فن کارانہ صلاحیت اور ہمدردی جیسی صفات میں اضافہ کرسکتی ہے۔اگرسائنس کوانسان دانش مندی سے بروئے کار لانے لگیں تو بہتر دنیا تعمیر کرنے کے امکانات لامتناہی ہوجائیں گے۔کسی اور جگہ میں اپنے ان خدشات کا اظہار کر چکا ہوں کہ انسان سائنس سے حاصل ہونے والی قوت کوعقلمندی سے استعمال نہیں کرسکتے۔ یہاں میری دلچسپی اُس اچھائیوں سے ہے جوانسان اگر چاہیں تو پیدا کرسکتے ہیں۔لہٰذا اس سوال کونظر انداز کردینا ہی بہتر ہے کہ آیا انسان اچھائی کے بجائے برائی کا انتخاب کریں گے۔

انسانی زندگی پر سائنس کے اطلاق سے متعلق ایک رویہ ایسا ہے جس سے میں اتفاق تو نہیں کرتا، لیکن اُس سے تھوڑی بہت ہمدردی ضرور رکھتا ہوں۔ یہ اُن لوگوں کا رویہ ہے جو غیر فطری چیزوں سے خائف رہتے ہیں۔ یورپ میں روسو اس نقطہ نظر کا ایک نمایاں حامی ہے۔ایشیا میں چوبیس صدیاں پہلے چینی فلسفی لاوزے نے اس نقطہ نظر کو زیادہ قائل کرنے والے انداز میں پیش کیا تھا۔میرے نزدیک ''فطرت'' کی مدح سرائی میں سچ اور جھوٹ ایک دوسرے میں ضم ہوگئے ہیں اورانہیں ایک دوسرے سے جدا کرنا ضروری

ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ''فطرت'' سے کیا مراد ہے؟ سیدھے سادھے لفظوں میں یوں کہیے کہ اس سے مراد وہ سب کچھ ہے جس سے بات کرنے والا اپنے بچپن میں آشنا تھا۔ لاوزے سڑکوں، گھوڑا گاڑیوں اور کشتیوں پر اعتراض کرتا تھا۔ غالباً ان میں سے کوئی چیز بھی اُس گاؤں میں موجود نہ تھی جس میں لاوزے پیدا ہوا تھا۔ روسو چونکہ ان چیزوں کا عادی ہو چکا تھا، اس لئے وہ انہیں ضرور طوفان برپا کر دیتا۔ اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ لباس اور کھانے پکانے کا کام انسان چونکہ زمانہ قدیم سے کرتا چلا آ رہا ہے، اس لئے کوئی فطرت پرست ان کی مخالفت نہیں کرتا، البتہ وہ ان امور میں نئے رواجوں کی مذمت کرتے ہیں۔ ہمارے زمانے میں ایسے لوگ ہیں جو تجرد کو قبول کر لیتے ہیں لیکن برتھ کنٹرول کو بُرا سمجھتے ہیں۔ وجہ بس یہ ہے کہ تجرد کا رواج پرانے زمانے سے چلا آتا ہے جب کہ برتھ کنٹرول ایک نیا رجحان ہے۔ ان سارے معاملات میں ہم دیکھتے ہیں کہ ''فطرت'' کا درس دینے والوں میں ہم آہنگی اور استقلال موجود نہیں۔ ہم انہیں محض قدامت پرست قرار دے سکتے ہیں۔

خیر اس کے باوجود فطرت پرستوں کے حق میں بھی کچھ کہا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر وٹامنز کی مثال لیجئے جن کی دریافت نے ''فطرتی'' اشیائے خوردنی کے بارے میں ناگواری سی پیدا کر دی ہے۔ تاہم ہم دیکھتے ہیں کہ وٹامنز بجلی کی روشنی کا ڈلیور آئیل سے بھی حاصل کئے جا سکتے ہیں، حالانکہ یہ دونوں اشیا انسانوں کی ''فطری'' خوراک میں شامل نہیں ہیں۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ علم کی غیر موجودگی میں فطرت سے کی جانے والی کوئی نئی علیحدگی غیر متوقع نقصان بھی پہنچا سکتی ہے۔ البتہ جب نقصان کا فہم حاصل ہو جائے تو پھر کسی نئی مصنوعی شے سے اُس کا علاج بھی کیا جا سکتا ہے۔ جہاں تک ہمارے طبعی ماحول اور ہماری خواہشوں کی تسکین کے طبق ذرائع کا تعلق ہے، میرا نہیں خیال کہ فطرت کا نظریہ نئی مصلحتوں کو اختیار کرنے کے معاملے میں ایک خاص تجرباتی احتیاط سے زیادہ کسی شے کو جائز بناتا ہے۔ مثال کے طور پر لباس غیر فطری ضرورت ہے اور وہ ایک غیر فطری عمل یعنی کپڑے دھونے کی ضرورت پیدا کر دیتا ہے--- بشرطیکہ ہم کپڑوں کو بیماری کا سبب نہ بنانا چاہتے ہوں، لیکن یہ دونوں غیر فطری کام، یعنی کپڑے پہننا اور انہیں صاف ستھرے رکھنا، مل کر آدمی کو اُس وحشی سے زیادہ صحت مند بنا دیتے ہیں جو ان کاموں کو پسند

نہیں کرتا۔

انسانی خواہشوں کے ضمن میں ''فطرت'' کے حق میں اور بھی بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ مردوں، عورتوں اور بچوں پر اُن کے شدید ترین جذبوں کی مزاحمت کرنے والی زندگی مسلط کرنا نہ صرف ظلم ہے بلکہ خطرناک بھی ہے۔ اس مفہوم میں ''فطرت'' سے ہم آہنگ زندگی کو بعض شرائط کے ساتھ قابل تعریف سمجھنا چاہیے۔ بجلی کی زیرِ زمین ریلوے سے زیادہ مصنوعی شے اور کیا ہو سکتی ہے، لیکن جب کسی بچے کو اس ریلوے کے ذریعے سفر کروایا جائے تو اُس کی فطرت کو کوئی ضعف نہیں پہنچتا۔ اس کے برعکس کم و بیش تمام بچے ایسی ریل میں سفر کر کے خوش ہوتے ہیں۔ اگر وہ کوئی فرق نہ ہو تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ عام انسان کی خواہشوں کو تسکین دینے والی مصنوعی اشیا اچھی ہوتی ہیں۔ لیکن ان انداز ہائے زندگی کے بارے میں ہم یہ بات نہیں کہہ سکتے جو اس لحاظ سے مصنوعی ہوتے ہیں کہ ہم انہیں منتخب نہیں کرتے بلکہ اتھارٹی یا معاشی ضرورت انہیں ہمارے اوپر مسلط کر دیتی ہے۔ بلاشبہ آج کے زمانے میں زندگی کے اس قسم کے اسلوب کسی حد تک ضروری ہیں لیکن اس قسم کی مجبوریاں افسوس ناک ہی ہیں اور ہمیں ان سے بچنے کے طریقے تلاش کرنے چاہئیں۔ تھوڑی بہت محنت ایسی چیز نہیں کہ جس کی شکایت کی جائے بلکہ دس میں سے نو صورتوں میں خاص حد تک محنت مکمل کاہلی کے مقابلے میں انسان کو خوشی عطا کرتی ہے لیکن آج کے دور میں اکثر لوگوں کو جس قدر اور جس قسم کی محنت کرنا پڑتی ہے، وہ یقیناً گمبھیر قسم کی برائی ہے۔ زندگی بھر کی روٹین کی غلامی خاص طور پر قابل مذمت ہے۔ زندگی کو قاعدوں اور ضابطوں کی زنجیروں میں جکڑا ہوا نہیں ہونا چاہیے۔ ہماری خواہشیں اگر دوسروں کے لیے تباہ کن اور خطرناک نہ ہوں تو پھر انہیں آزادانہ اظہار کا موقع ملنا چاہیے۔ مہم جوئی کے لیے زندگی کی گنجائش ہونی چاہیے۔ ہمیں انسانی فطرت کا احترام کرنا چاہیے۔ کیونکہ ہمارے جذبے اور خواہش ہی وہ مواد ہیں جن سے مسرت کی تشکیل ہوتی ہے۔ انسانوں کو تجریدی ''اچھائی'' سے بہلانا بے معنی سی بات ہے۔ اگر ہم ان کی خوشیوں میں اضافہ کرنا چاہتے ہیں تو پھر انہیں وہ کچھ دینا ہوگا جس کے وہ خواہش مند ہیں، یا جس کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ ممکن ہے سائنس وقت کے ساتھ ہماری خواہشوں کی اس طرح صورت گری کرنے پر قادر ہو جائے کہ وہ آج کی طرح دوسرے لوگوں کی خواہشوں سے متصادم نہ

رہیں۔تب ہم زمانہ حال کے مقابلے میں اپنی خواہشوں کے زیادہ حصے کی تسکین کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔ پھر صرف اور صرف اس مفہوم میں ہماری خواہشیں بہتر ہو جائیں گی۔علیحدہ علیحدہ کر کے دیکھا جائے تو کوئی خواہش کسی دوسری خواہش سے بہتر نہیں ہوا کرتی۔لیکن اگر خواہشوں کے دو گروپ ہوں جن میں سے پہلے گروپ میں شامل تمام خواہشوں کی بیک وقت تسکین ممکن ہو جب کہ دوسرے گروپ میں بعض خواہشیں آپس میں متصادم ہوں تو ہم پہلے گروپ کی خواہشوں کو بہتر قرار دے سکتے ہیں۔اسی لئے ہم محبت کو نفرت سے بہتر قرار دیتے ہیں۔

طبعی فطرت کا احترام کرنا احمقانہ کام ہے۔اس کے بجائے انسانی مقاصد کی ممکنہ حد تک تکمیل کے حوالے سے طبی فطرت کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ جہاں تک اخلاقی نقطہ نظر کا تعلق ہے، طبی فطرت اچھی ہے نہ بُری۔ جہاں کہیں طبعی اور انسانی فطرتیں ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتی ہیں، جیسا کہ مثلاً آبادی کے مطالعے میں ہوتا ہے، تو وہاں ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ جانا آبادی کے مسئلے سے نمٹنے کے لئے جنگ نہ کرنا اور مہک وباؤں اور قحط کا انتظار کرنا ٹھیک نہیں۔ مذہبی لوگ آبادی پر کنٹرول کی مخالفت کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ آبادی میں اضافے کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہ ڈالی جائے۔اگرچہ اُن کی رائے کو کوئی شخص بھی زیادہ اہمیت نہیں دیتا، لیکن سوال یہ ہے کہ آبادی کے مسئلے کو طبعی طریقوں کے ذریعے کیوں حل نہ کیا جائے۔؟ اس سوال کا اگر کوئی جواب دیا جاتا ہے تو وہ بھی بوسیدہ عقائد پر مبنی ہوتا ہے۔ یہ بھی ہے کہ مذہبی لوگ فطرت کی جس خلاف ورزی کی وکالت کرتے ہیں وہ اتنی ہی شدید ہے جتنی برتھ کنٹرول میں ہو سکتی ہے۔ مذہبی لوگ انسانی فطرت پر اُس تشدد کو ترجیح دیتے ہیں جس پر جب کامیابی سے عمل کیا جائے تو وہ رنجیدگی، حسد، ایذا رسانی کے رجحان اور اکثر اوقات جنون کو شامل حال رکھتا ہے۔ان کے مقابلے میں طبعی فطرت کے خلاف ایسے تشدد کو ترجیح دیتا ہوں جو ویسا ہی ہے جیسا سٹیم انجن یا پھر چھتری کے استعمال میں شامل ہوتا ہے۔ یہ مثال اس امر کو اجاگر کر دیتی ہے کہ اس اصول کا اطلاق کس قدر مبہم اور غیر یقینی ہے کہ ہمیں ''فطرت'' کی پیروی کرنی چاہیے۔

''فطرت'' یہاں تک کہ انسانی فطرت بھی وقت کے ساتھ مطلق واقعہ کی حیثیت سے محروم ہوتی جائے گی اور وہ سائنس کے تقاضوں کے مطابق ڈھلتی جائے گی۔ سائنس

اگر چاہے تو وہ ہماری آئندہ نسلوں کو اچھی زندگی مہیا کر سکتی ہے۔ کیونکہ وہ انہیں علم وضبط نفس اور فساد کے بجائے ہم آہنگی کی صفات عطا کر سکتی ہے۔ تاہم اس وقت صورت حال بالکل مختلف ہے اور سائنس ہمارے بچوں کو ایک دوسرے کو قتل کرنے کا درس دے رہی ہے۔ اس رویے کا ایک سبب یہ ہے کہ بہت سے سائنس دان محض اپنی خوش حالی کی خاطر نسل انسانی کو قربان کرنے پر آمادہ ہیں۔ تاہم یہ مرحلہ اُس وقت ختم ہو جائے گا جب انسان اپنے جذبوں پر ویسا ہی غلبہ حاصل کر لیں گے جیسا غلبہ وہ خارجی دنیا کی قوتوں پر پہلے ہی حاصل کر چکے ہیں، تب آخر کار ہم اپنی آزادی سے بہرہ ور ہو سکیں گے۔

آزادی اور معاشرہ

یہاں میں اس مسئلے پر بحث کرنا چاہتا ہوں کہ معاشرے میں رہنے والے انسانوں کے لیے آزادی کس حد تک ممکن ہے اور کس حد تک پسندیدہ۔

شاید پہلے ہمیں آزای کی تعریف پر توجہ دینا چاہیے۔ یہ ایک ایسی اصطلاح ہے جس کو بہت سے معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ لہٰذا مفید استدلال کی خاطر ہمیں ان میں سے کسی ایک تعریف کا فیصلہ کر لینا چاہیے۔ اس کے مقابلے میں معاشرہ (برادری) کسی قدر کم مبہم اصطلاح ہے لیکن اس کی وضاحت بھی ضروری ہے۔

میرے خیال میں الفاظ کو قیاسی مفہوم میں استعمال کرنا پسندیدہ بات نہیں۔ مثال کے طور پر دیکھیے کہ جرمن فلسفی ہیگل اور اس کے مقلد سمجھتے ہیں کہ ''سچی'' آزادی پولیس کی فرماں برداری کے حق سے عبارت ہے۔ وہ اسے عام طور پر اخلاقی قانون کا عنوان دیتے ہیں۔ اب اس میں شبہ نہیں کہ پولیس کو اپنے اعلیٰ حکام کا حکم ماننا چاہیے مگر اس تعریف سے ہمیں یہ پتہ چلتا کہ خود حکومت کے فرائض کیا ہیں۔ اس نقطۂ نظر کو تسلیم کرنے والوں کا عملی طور پر استدلال یہ ہے کہ ریاست لازماً اور اپنی تعریف کے اعتبار سے بے خطا ہوتی ہے لیکن آپ جانتے ہیں کہ یہ تعریف ان ملکوں کے حوالہ سے غیر موزوں ہے جن میں جمہوریت رائج ہے اور جماعتی حکومتیں قائم ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اس قسم کے ملک میں لگ بھگ آدھی قوم حکومت کو بدکار اور بداعمال خیال کرتی ہے لہٰذا ہم ''سچی'' آزادی کو آزادی کے متبادل کے طور پر استعمال نہیں کر سکتے۔

انتہائی تجریدی مفہوم میں ''آزادی'' کا مطلب ہے خواہشوں کی تکمیل میں بیرونی رکاوٹوں کی عدم موجودگی۔ اس تجریدی مفہوم کے حوالے سے قوت میں اضافہ کر کے یا پھر خواہشوں میں کمی کر کے آزادی میں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ اس تعریف کے لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ زندگی کے دو چار روز گزار کر سردی سے مر جانے والا کیڑا مکمل آزادی سے ہمکنار رہتا ہے، کیونکہ سردی اس کی خواہشوں کو یوں بدل دیتی ہے کہ اس کے

پاس محال کے حصول کی خواہش کے لیے کوئی لمحہ باقی نہیں رہتا- انسان بھی اس قسم کی آزادی تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں- کیمونسٹ اور ریڈ آرمی کمیسار بن جانے والے ایک نوجوان روسی امیر نے مجھے بتایا تھا کہ روسیوں کی طرح انگریزی کو جسمانی جکڑ بندی کی ضرورت نہیں ہوتی' کیونکہ ان کے ذہن اور روحیں ہمیشہ اس قسم کی جکڑ بندیوں میں جکڑی رہتی ہیں- شاید اس بات میں تھوری بہت سچائی شامل ہے- بلا شبہ دوستو وسکی کے کردار حقیقی روسیوں سے مختلف ہیں' لیکن وہ ایسے کردار ہیں جن کو ایک روسی ہی تخلیق کر سکتا تھا- وہ سب ایسی متشدد خواہشات کے حامل ہیں جن سے ایک عام انگریز' کم از کم جہاں تک اس کی شعوری زندگی کا تعلق ہے' آزاد ہوتا ہے- یہ امر بالکل واضح ہے کہ اگر کسی معاشرے کے تمام افراد ایک دوسرے کو قتل کرنے کی خواہش رکھتے ہوں تو پھر وہ اس معاشرے جتنا آزاد نہیں ہو سکتا جس کے ارکان زیادہ پرامن خواہشوں کے حامل ہیں- اس کا مطلب یہ ہوا کہ خواہش کی ترمیم و اصلاح سے آزادی کو اتنا ہی فائدہ پہنچ سکتا ہے جتنا کہ قوت میں اضافے سے پہنچتا ہے-

یہ امر ایک ایسی ضرورت کو واضح کرتا ہے جس کو سیاسی فکر میں اکثر اوقات نظر انداز کر دیا جاتا ہے- میری مراد اس شے سے ہے جس کو ہم ''نفسیاتی حرکات'' کا عنوان دے سکتے ہیں- عام طور پر سیاسیات میں انسانی فطرت کو ایک ایسے مقولہ کے طور پر قبول کر لیا جاتا ہے جس سے خارجی حالات کو مطابقت اختیار کرنا ہوتی ہے- تاہم سچی بات یہ ہے کہ خارجی حالات انسانی فطرت پر اثر انداز ہوتے ہیں اور اسے تبدیل کرتے ہیں اور یہ کہ ان دونوں کے درمیان' یعنی انسانی فطرت اور خارجی حالات کے درمیان ہم آہنگی باہمی تعامل کے ذریعہ ہی حاصل ہو سکتی ہے- اگر ہم کسی شخص کو ایک ماحول سے نکال کر اچانک دوسرے ماحول میں لے آئیں تو ہو سکتا ہے وہ آزادی سے بہرہ ور نہ ہو سکے' چاہیے وہ نیا ماحول ان لوگوں کو آزادی مہیا کرتا ہو جو اس کے عادی ہیں- لہٰذا ہم تغیر پذیر ماحول کے زیرِ اثر پیدا ہونے والی مختلف خواہشوں کے امکان پر نگاہ رکھے بغیر آزادی کے مسئلے سے نبرد آزما نہیں ہو سکے- بعض صورتوں میں اس سے آزادی کا حصول مشکل تر ہو جاتا' کیونکہ نیا ماحول پرانی خواہشوں کی تسکین کرنے کے باوجود ایسی نئی خواہشیں پیدا کر سکتا ہے جن کی تسکین اس کے بس کا روگ نہ ہو- اس امکان کی وضاحت صنعت کاری کے

نفسیاتی اثرات سے کی جاسکتی ہے۔ صنعتی ترقی نئی ضرورتوں اور حاجتوں کو پروان چڑھاتی ہے۔ کوئی شخص محض اس لیے رنجیدہ ہوسکتا ہے کہ وہ موٹر کار نہیں خرید سکتا۔ جلد ہی ہم سب اپنا اپنا طیارہ بھی خریدنا چاہیں گے۔ یہی نہیں بلکہ کوئی شخص اپنی لاشعوری ضروریات کے حوالے سے بھی رنجیدہ ہوسکتا ہے۔ مثلاً امریکیوں کو آرام کی ضرورت ہے' لیکن وہ اس سے آگاہ نہیں ہیں۔ میرے خیال میں امریکہ میں جرائم کی لہر کی بڑی حد تک توجیہہ اسی بابت کے حوالے سے کی جاسکتی ہے۔

لوگوں کی خواہشیں ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں لیکن بعض ایسی بنیادی ضرورتیں ہیں جن کو ہم کم وبیش عالمگیر قرار دے سکتے ہیں ان میں روٹی' پانی' صحت' لباس' رہائش' جنس اور ولدیت اہم ترین ہیں۔ (ویسے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ گرم علاقوں میں رہائش اور لباس مطلق ضروریات نہیں ہیں پھر بھی منطقہ حارہ کے علاقوں کو چھوڑ کر ہم ان کو فہرست میں شامل کر سکتے ہیں) اب معاملہ یہ ہے کہ آزادی میں جو کچھ بھی شامل ہو' لیکن اس فہرست میں شامل کی جانے والی کسی شے سے محروم ہوکر کوئی شخص آزاد نہیں ہوسکتا۔ یہ اشیا تو آزادی کا کم ازکم تقاضا ہیں۔

آیئے اب ہم ''معاشرے'' کی تعریف پر توجہ دیں۔ یہ حقیقت بالکل واضح ہے کہ یہاں ہم نے کم ازکم آزادی کی جو بات کی ہے وہ جنگلوں میں زندگی بسر کرنے والے رابن سن کروسو کے مقابلے میں معاشرے میں رہنے والے کسی فرد کو بہتر طور پر حاصل ہوسکتی ہے۔ معاملہ یہ ہے کہ جنس اور ولدیت بنیادی طور پر سماجی نوعیت کی حامل ہیں۔ ''معاشرے'' کی تعریف ہم یوں کر سکتے ہیں کہ اس سے تعاون کرتے ہیں۔ جہاں تک انسانوں کا تعلق ہے' خاندان سب سے ابتدائی سماجی گروہ ہے۔ معاشی سماجی گروہوں نے بہت بعد میں جنم لیا تھا۔ جنگ میں تعاون کرنے والے گروہ بظاہر اس قدر ابتدائی نہیں ہیں۔ دنیائے جدید میں معیشت اور جنگ سماجی پیوستگی کے اہم محرکات ہیں۔ خاندان یا قبیلہ کی سطح سے آگے بڑھ کر معاشرے نے جو ترقی کی ہے' اس کی طفیل ہماری آزادی میں اضافہ ہوا ہے۔ یہ سمجھا جاتا ہے کہ منظّم معاشرے میں ہم زیادہ محفوظ ہوتے ہیں اور دشمنوں کے ہاتھوں مرے جانے کا امکان کم ہوتا ہے۔ تاہم یہ دعویٰ مشتبہ ہی ہے۔

اگر ہم نفسیاتی حرکیات کو نظر انداز کرتے ہوئے کسی شخص کی خواہشات کو بنیادی

حیثیت دیں تو پھراس کی آزادی کی راہ میں رکاوٹیں دوقسم کی ہیں- یعنی طبعی اور سماجی- آیئے ہم سادہ سی مثال سے اس بات کی وضاحت کریں- ممکن ہے کہ دھرتی سے اتنی خوراک نہ پیدا ہوتی ہو کہ وہ کسی شخص کی ضرورت پوری کر سکے- یہ بھی ہوسکتا ہے کہ دوسرے لوگ اسے خوراک حاصل نہ کرنے دیں- گویا ایک طرف معاشرہ فرد کی آزادی کی راہ میں حائل طبعی رکاوٹوں کو کم کرتا ہے تو دوسری طرف وہ سماجی رکاوٹیں پیدا بھی کرتا ہے- تاہم یہاں ہم خواہش پر معاشرے کے اثر کونظرانداز کرنے سے غلطی کا شکار ہو سکتے ہیں- یہ فرض کیا جا سکتا ہے کہ چیونٹیاں اور شہد کی مکھیاں بہت ہی منظّم گروہوں کی صورت میں رہتی ہیں' اس لیے وہ ہمیشہ بےساختہ طور پر وہی عمل کرتی ہیں جو ان کے گروہی فرائض کا تقاضا ہے- یہ بات اعلیٰ ترقسم کے غول پسند جانوروں کے معاملے میں بھی درست ہے- ممکن ہے کہ دو وحشت کے انسانوں کی صورت حال اس سے مختلف نہ ہو- لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ مہذب انسان اگرچہ زیادہ ترقی یافتہ معاشرے کی تشکیل کرتے ہیں' لیکن اپنی جبلتوں کے لحاظ سے وہ کم سماج پرست دکھائی دیتے ہیں- یہی وجہ ہے کہ وہ آزادی کے مسئلہ کوموضوع بحث بناتے ہیں-

میں اس حقیقت سے انکار کا ہرگز ارادہ نہیں رکھتا کہ سب سے زیادہ مہذب معاشروں میں بھی سماجی تعاون کی ایک جبلی اساس ہوا کرتی ہے- لوگ یہ چاہتے ہیں کہ وہ اپنے ہمسائیوں جیسے ہوں اور وہ انہیں پسند بھی کریں- وہ ان کی راہ پر چلتے ہیں- پھر بھی لوگ جب زیادہ مہذب ہو جاتے ہیں تو لگتا ہے کہ یہ عوامل دھندلے پڑ جاتے ہیں- بالغوں کے مقابلے میں یہ عوامل سکول جانے والے بچوں میں زیادہ مضبوط ہوتے ہیں- ویسے بھی مجموعی طور ہم دیکھتے ہیں کہ کم ذہین افراد میں یہ عوامل کچھ زیادہ ہی مضبوط ہوتے ہیں- سماجی تعاون کی بنیاد اب گروہی جبلت کے بجائے اس تعاون کے فوائد کا عقلی فہم بنتا جا رہا ہے- غیرمہذب انسانوں میں انفرادی آزادی کا مسئلہ سرنہیں اٹھاتا تھا' کیونکہ انہیں اس کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوتی تھی لیکن مہذب انسان جوں جوں زیادہ تہذیب یافتہ ہوتے جا رہے ہیں' اس مسئلے کی شدت بھی بڑھتی جا رہی ہے- دوسری طرف صورت حال یہ ہے کہ جوں جوں یہ امر واضح ہو رہا ہے کہ حکومت آزادی کی راہ میں حائل طبعی رکاوٹوں کو دور کرکے ہمیں آزاد ہونے میں مدد دے سکتی ہے' توں توں افراد کی زندگی کی تنظیم کاری

میں حکومت کا کردار بڑھتا جا رہا ہے- صاف طور پر اس کا مطلب یہ ہے کہ تہذیب کا قافلہ آگے بڑھتا رہا تو پھر معاشرے میں آزادی کا مسئلہ بھی شدید تر ہوتا جائے گا-

یہ بات بالکل واضح ہے کہ حکومت کے اختیارات میں کمی سے آزادی میں اضافہ نہیں ہوتا- وجہ یہ ہے کہ لوگوں کی خواہشیں ایک دوسرے سے متصادم ہوتی ہیں- لہٰذا انارکی کا مطلب طاقتوروں کے لیے آزادی اور کمزوروں کے لیے غلامی ہوگا- حکومت کے بغیر عالمی آبادی موجودہ تعداد کا بمشکل دسواں حصہ رہ جائے گی- قحط اور بچوں کی اموات آبادی کو ہڑپ کر جائیں گی- عام زمانوں میں مہذب معاشروں میں جو سماجی غلامی پائی جاتی ہے' اس سے بدتر جسمانی غلامی کا رواج ہو جائے گا لہٰذا ہمارے پیش نظر مسئلہ یہ نہیں کہ حکومت کے بغیر کام کیسے چلایا جائے بلکہ مسئلہ یہ ہے کہ آزادی میں حکومت کی مداخلت کو کم سے کم روا رکھتے ہوئے حکومت کی موجودگی سے زیادہ سے زیادہ فائدہ کیونکر حاصل کئے جا سکتے ہیں اس کا مطلب جسمانی اور سماجی آزادی میں توازن پیدا کرنا ہے- سادہ لفظوں میں یوں کہیئے کہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ زیادہ خوراک اور بہتر صحت کے حصول کے لیے ہمیں حکومتی دباؤ کو مزید کس حد تک برداشت کرنا چاہیے؟

اس حوالے سے سادہ سا معاملہ یہ ہے کہ آیا خوراک اور صحت ہمارے لیے ہے یا کسی اور کے لیے؟ دیکھا گیا ہے کہ لوگ جب محاصرے میں آتے ہوں' یا جیسا کہ ۱۹۱۷ء سے انگلینڈ کی صورت حال تھی' تو پھر وہ ہر حد تک حکومتی دباؤ قبول کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں' کیونکہ انہیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ دباؤ سب کے فائدہ کے لیے ہے- لیکن جب صورتحال یہ ہو کہ ایک شخص حکومت کے ستم برداشت کرے اور دوسرا خوراک حاصل کرے تو پھر معاملہ بالکل مختلف ہو جاتا ہے- یوں ہم سرمایہ داریت اور اشتراکیت کے مسئلے پر جا پہنچتے ہیں- سرمایہ داری کی حمایت کرنے والے آزادی کے مقدس اصولوں کا بہت چرچا کرتے ہیں- ان اصولوں کو ہم اس ایک کلیے میں پیش کر سکتے ہیں کہ' جو خوش قسمت ہیں انہیں بدقسمتوں کے استحصال سے نہ روکا جائے-

عدم مداخلت کا پرچار کرنے والے لبرلزم اس کلیے پر مبنی ہے تاہم اسے انارکیت نہیں سمجھنا چاہیے- وہ بدقسمتوں کو قتل و غارت اور بغاوت و سرکشی سے روکنے کے لیے قانون کا سہارا لیتا ہے- جب تک ممکن تھا' اس نے ٹریڈ یونین ازم کی مخالفت بھی کی تھی-

البتہ اس قدر حکومتی مداخلت کے بعد وہ اپنے باقی مقاصد معاشی قوت کے ذریعے حاصل کرنے کے درپے تھا- لبرلزم سرمایہ دار کو یہ حق دیتا تھا کہ وہ مزدور سے کہے کہ ''تم بھوک سے مر جاؤ گے-'' لیکن وہ مزدور کو یہ حق نہ دیتا تھا کہ وہ سرمایہ دار سے یہ کہے کہ ''مجھ سے پہلے تم گولی سے اڑا دیئے جاؤ گے-'' قانونی موشگافیاں اپنی جگہ' لیکن ان دونوں دھمکیوں میں فرق کرنا محض حماقت ہے- دونوں یکساں طور پر آزادی کے لیے خطرہ بنتی ہیں- تاہم لبرلزم نے جس عدم مساوات کو فروغ دیا وہ صرف معاشی شعبے تک محدود نہیں- بلکہ اس نظام نے عورتوں پر شوہروں کی اور بچوں پر باپوں کی آمریت کا جواز پیش کرنے کے لیے بھی آزادی کے مقدس اصولوں کو استعمال کیا- تاہم ہمیں قرار کرنا چاہیے کہ لبرلزم عورتوں پر شوہروں کی آمریت کو کم کرنے کا رجحان رکھتا تھا- بچوں کو کارخانوں میں کام کرنے پر مجبور کرنے کا جہاں تک تعلق ہے' بچوں پر باپ کی آمریت لبرلزم کے حامیوں کے باوجود کم ہوتی چلی گئی-

خیر' اس موضوع پر پہلے ہی بہت کچھ کہا اور لکھا جا چکا ہے- میں اس سے چمٹے رہنے کی خواہش نہیں رکھتا- لہٰذا میں ایک زیادہ عمومی مسئلے کی طرف رخ کرتا ہوں- وہ مسئلہ یہ ہے کہ معاشرے کو دوسرے فرد کی بجائے خود معاشرے کی خاطر کسی فرد کی زندگی میں کس حد تک مداخلت کرنی چاہیے؟ نیز یہ کہ کن مقاصد کی خاطر معاشرے کو مداخلت کرنی چاہیے؟

میرے خیال میں آزادی کے کم از کم لوازمات یعنی خوراک' پانی' صحت' رہائش' لباس' جنس اور ولدیت کو دوسرے امور پر ترجیح حاصل ہونی چاہیے- یہ چیزیں زندگی کی بقا کے لیے ضروری ہیں- لہٰذا ہم انہیں ضروریات قرار دے سکتے ہیں- ان کے بعد آنے والی اشیا کا شمار ہم حالات کے حوالے سے' سامان آسائش یا اشیائے عیش و عشرت میں کر سکتے ہیں- میں اسے ایک مقدم شرط کے طور پر تسلیم کر لوں گا کہ کسی اور ایک فرد کو ضروریات زندگی فراہم کرنے کی غرض سے کسی دوسرے شخص کو سامان آسائش سے محروم کرنا جائز ہے- ممکن ہے کہ کسی معاشرے میں کسی خاص زمانے میں یہ بات سیاسی یا معاشی طور پر مفید نہ ہو- تاہم آزادی کے حوالے سے اس بات کو قابلِ اعتراض نہیں ٹھہرایا جا سکتا- وجہ یہ ہے کہ کسی شخص کو ضروریات زندگی سے محروم رکھنا آزادی کے اصول کو زیادہ شدید خلاف ورزی ہے- اس کے مقابلے میں کسی شخص کو سامان عیش و عشرت سمیٹنے سے

روکنا کم اہم ہے۔

اس نقطۂ نظر کو قبول کر لیا جائے تو بات دور تک پہنچتی ہے۔ بلدیاتی انتخابات میں ایک حل طلب مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ عوامی صحت، ماں بچے کی دیکھ بھال اور بچوں کی بہبود جیسے امور کے لیے کس قدر وسائل مخصوص کئے جائیں۔ اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ ان امور پر خرچ ہونے والی رقم سے زندگی بچانے میں بہت مدد ملتی ہے۔ لندن شہر کے تمام حلقوں میں امیر لوگ اس رقم میں اضافے کو روکنے اور ممکن ہو تو کم کرنے کے لیے آپس میں مل جاتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ امیر لوگ ہزاروں افراد کو لقمہ اجل بنانے پر آمادہ ہوتے ہیں تاکہ ان کی عیش و عشرت میں کوئی فرق نہ آئے۔ اب چونکہ اخبارات پر بھی ان کو اثر و رسوخ حاصل ہوتا ہے۔ اس لیے وہ ستم رسیدہ انسانوں سے حقائق کو چھپانے میں بھی کامیاب ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ تحلیل نفسی کے ماہرین کے جانے پہچانے طریقوں سے وہ ان حقائق کو اپنے آپ سے بھی چھپا لیتے ہیں۔ ویسے بھی اس میں کوئی نرالی بات نہیں۔ دنیا میں ہر جگہ اور ہر زمانے میں امر کا یہی وطیرہ رہا ہے۔ یہاں میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آزادی کی بنیاد پر ان کے طرزِ عمل کا دفاع نہیں کیا جا سکتا۔

جنس اور ولدیت کے حق پر میں بحث نہیں کرنا چاہا۔ تاہم اس قدر ضرور کہوں گا کہ مسیحی رہبانیت کی روایت کا ایک ناخوشگوار نتیجہ یہ سامنے آیا کہ لوگ روٹی کے حق کو تو تسلیم کرتے ہیں، لیکن جنس کے حق کو نظر انداز کر دیئے ہیں۔ سیاست دانوں کے پاس اتنا وقت ہی نہیں کہ وہ انسانی فطرت کو جان سکیں۔ عام مردوں اور عورتوں کو متحرک کرنے والی خواہشوں کا انہیں کچھ علم ہی نہیں ہے۔ اگر کسی سیاست جماعت کے قائدین نفسیات کی تھوڑی بہت سوجھ بوجھ رکھتے ہوں تو وہ جماعت غیر معمولی کامیابیاں حاصل کر سکتی ہے۔

اچھا میں تو مانتا ہوں کہ لوگوں کو ضروریات زندگی مہیا کرنے کی غرض سے معاشرے کو دخل دینے کا حق حاصل ہے۔ لیکن یہ بات تسلیم نہیں کرتا کہ ان امور میں بھی معاشرے کی دخل اندازی جائز ہے جن میں فرد اپنی کامیابیاں دوسروں کی قیمت پر حاصل نہیں کرتا۔ یہاں میں نقطۂ نظر، علم اور آرٹ کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ کسی معاشرے کی اکثریت اگر کسی رائے کو، کسی نقطۂ نظر کو پسند نہیں کرتی تو بھی اسے اس رائے کے حامل افراد کو راہِ راست پر لانے کا کوئی حق نہیں۔ اسی طرح اگر کسی معاشرے کی اکثریت بعض

حقائق کو جاننے کی روادار نہیں تو اسے یہ حق حاصل نہیں ہو جاتا کہ ان حقائق کو جاننے کے آرزومند افراد کی جیل کو کال کوٹھری میں ڈال دیا جائے۔

میں ایک خاتون کو جانتا ہوں جس نے ٹیکساس کی خاندانی زندگی کے موضوع پر ایک مفصل کتاب لکھی ہے۔ میرے خیال میں علم ساجیات کے حوالے سے یہ ایک قابلِ قدر کتاب ہے۔ اب چونکہ پولیس کے خیال میں حقائق کی اشاعت بہت بری بات ہے' لہٰذا اس نے ڈاک کے ذریعے اس کتاب کی ترسیل کو غیر قانونی قرار دے رکھا ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ تحلیل نفسی کے مریضوں کا علاج اکثر اوقات محض اس طریقے سے کیا جاتا ہے کہ انہیں لاشعور میں ٹھنسے ہوئے حقائق دوبارہ شعور میں لانے پر آمادہ کیا جاتا ہے۔ بعض حوالوں سے معاشرہ بھی ان مریضوں جیسا ہوتا ہے۔ لیکن اپنے علاج کا موقع دینے کے بجائے معاشرہ اس ڈاکٹر کو سزا دیتا ہے جو ناپسندیدہ حقائق کو اس کے سامنے پیش کرتا ہے۔ آزادی میں مداخلت کی یہ نہایت ہی ناپسندیدہ صورت ہے۔ ذاتی اخلاقی ضابطوں میں مداخلت کے بارے میں بھی یہی بات درست ہے۔ اگر کوئی مرد دو بیویاں رکھنا چاہتا ہے یا کوئی عورت دو شوہر رکھنے کی خواہش مند ہے تو یہ ان لوگوں کا آپس کا معاملہ ہے۔ دوسروں کو اس میں دخل دینے کی ضرورت محسوس نہ ہونی چاہیے۔

یہاں تک میں نے آزادی میں جائز مداخلتوں کی حدود کے بارے میں محض تجریدی استدلال پیش کیا ہے۔ اب میں زیادہ نفسیاتی امور کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں۔

جیسا کہ ہم بات کر چکے ہیں' آزادی کی راہ میں سماجی اور طبعی دو قسم کی رکاوٹیں حائل ہیں۔ آزادی کو یکساں نقصان پہنچانے والی کسی طبعی اور سماجی رکاوٹ میں سے سماجی رکاوٹ زیادہ نقصان دہ ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ غصہ اور آزردگی پیدا کرتی ہے۔ اگر کوئی لڑکا درخت پر چڑھنا چاہتا ہے اور آپ اسے روک دیتے ہیں تو اسے شدید غصہ آتا ہے۔ اس کے بجائے اگر وہ خود ہی درخت پر نہیں چڑھ سکتا تو اس طبعی رکاوٹ کو چپ چاپ مان لیتا ہے۔ غصے سے بچنے کی خاطر اکثر اوقات یہ بات مناسب ہو سکتی ہے کہ ان امور کی اجازت دے دی جائے جو بذات خود نقصان دہ ہیں۔ مثلاً وبا کے دنوں میں بھی لوگ عبادت کے لیے جانا چاہتے ہیں تو انہیں عبادت گاہ جانے دیجیے۔ حکومتوں کا طریقہ یہ ہے کہ وہ عوام کی ناراضگی سے بچنے کی خاطر بدقسمتیوں اور ناکامیوں کی ذمہ داری فطری اسباب پر تھوپ

دیتی ہیں- ان کے مقابلے میں مخالف سیاسی جماعتیں ان کا تعلق انسانی اسباب سے جوڑتی ہیں- مثلاً جب روٹی کی قیمت میں اضافہ ہوتا ہے تو حکومت خشک سالی اور بری فصل کو اس کا ذمہ دار قرار دیتی ہے- مخالف سیاسی جماعتیں دعویٰ کرتی ہیں کہ روٹی کی قیمت میں اضافہ حکومت کی غلط پالیسیوں اور منافع اندوزوں کے سبب ہوا ہے-

ترقی اور صنعت کاری کے زیر اثر عوام یہ یقین کرنے لگے ہیں کہ انسان کے امکانات اور صلاحیتیں بے پناہ ہیں- ان کا خیال ہے کہ کوئی ایسی قدرتی آفت نہیں جس پر انسان قابو نہ پا سکے- سوشلزم اسی عقیدے کی ایک صورت ہے کیونکہ اس کا کہنا یہ ہے کہ غریبی خدا نے نازل نہیں کی بلکہ وہ انسانی حماقت اور ظلم کا نتیجہ ہے- اس نقطۂ نظر نے فطری طور پر سرمایہ داروں کے بارے میں محنت کشوں کا رویہ تبدیل کر دیا ہے-

بسا اوقات انسان کے قادر مطلق ہونے کے عقیدے میں بہت ہی شدت پیدا کر دی جاتی یہ- چنانچہ بعض اشتراکی بظاہر یہ سمجھتے ہیں کہ اگر آبادی اس قدر بڑھ جائے کہ کرۂ ارض پر انسانوں کے لیے صرف کھڑا رہنے کی گنجائش رہ جائے، تو بھی سب کے لیے کافی مقدار میں خوراک موجود رہے گی- میرے نزدیک یہ احمقانہ مبالغہ آرائی ہے- بہرحال انسان کی قدرتِ کاملہ پر جدید ایمان کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ جب کوئی خرابی پیدا ہوتی ہے تو غصہ بڑھ جاتا ہے، کیونکہ اب تمام بدقسمتیوں اور آفتوں کے لیے انسان کو ذمہ دار ٹھہرایا جاتا ہے اور اس وقت بھی ان کا تعلق خدا سے یا فطرت سے نہیں جوڑا جاتا جب کہ ایسا کرنا جائز ہوسکتا ہے- یوں ماضی کے مقابلے میں اب انسانوں پر حکومت کرنا زیادہ دشوار ہوگیا ہے- دوسری طرف اسی سبب سے حکمران طبقوں کی مذہب میں دلچسپی بڑھ گئی ہے اور وہ مذہب سے اپنے لگاؤ کی نمائش کرتے رہتے ہیں، کیونکہ وہ چاہتے ہیں کہ ان کی رعایا بدقسمتیوں، مصیبتوں اور دیگر مسئلوں کے لیے انہیں موردالزام ٹھہرانے کے بجائے انہیں خدا کی مرضی تسلیم کرلیں- اس صورت حال میں بنیادی آزادیوں میں مداخلت کو جائز ثابت کرنا پہلے کے مقابلے یں بہت دشوار ہوگیا ہے- اب انہیں ناقابل تنسیخ قوانین قرار دینا ممکن نہیں رہا، حالانکہ علمائے مذہب اس پرانے طریقہ کار کے لیے جدوجہد کرتے ہیں-

سماجی آزادی میں رکاوٹیں پیدا کرنے سے صرف غصہ ہی پیدا نہیں ہوتا بلکہ دو اور ایسے اسباب بھی ہیں جو ان رکاوٹوں کو ناپسندیدہ بناتے ہیں- پہلا سبب یہ ہے کہ لوگ

دوسروں کی خوش حالی اور بہبود کو پسند نہیں کرتے - دوسرا سبب یہ ہے کہ لوگوں کو معلوم نہیں کہ دوسروں کی خوشی و بہبود کس بات پر منحصر ہے- شاید بنیادی طور پر یہ دونوں اسباب ایک ہی ہیں- کیونکہ جب ہم خلوص دل سے کسی دوسرے شخص کی بھلائی چاہتے ہیں تو عموماً ہم یہ جاننے میں کامیاب ہو جاتے ہیں کہ اس کی ضروریات کیا ہیں- بہر حال لوگ خواہ بدخواہی سے یا جہالت سے دوسروں کو نقصان پہنچائیں تو عملی نتائج میں فرق نہیں پڑتا - وہ ایک جیسے ہی رہتے ہیں- لہٰذا ان دونوں اسباب کو ایک ہی سمجھ سکتے ہیں اور کہہ سکتے ہیں کہ دوسروں کے مفادات کی حفاظت کے لیے کسی شخص یا طبقے پر اعتماد مشکل ہی سے کیا جا سکتا ہے-

جمہوریت کے حق میں پیش کیے جانے والے استدلال کی بنیاد یہی ہے- تاہم جدید ریاست میں جمہوریت افسروں کے وسیلے سے کام کرتی ہے' لہٰذا جہاں تک فرد کا تعلق ہے وہ بالواسطہ اور دوراز کار ہو جاتی ہے- افسر شاہی میں ایک خاص خطرہ پوشیدہ ہے' وہ یہ کہ عام طور پر افسر اپنے دفتروں میں بیٹھتے ہیں اور یہ دفاتر ان لوگوں سے بہت دور ہوتے ہیں جن پر وہ حکومت کرتے ہیں- تعلیم کی مثال ہی لے لیجئے - استاد بچوں کو تعلیم دیتے ہیں' اس لیے وہ بچوں کو اچھی طرح سمجھتے ہیں اور ان کی پرواہ بھی کرتے ہیں' لیکن اساتذہ کو کنٹرول ایسے افسر کرتے ہیں جن کو کوئی عملی تجربہ نہیں ہوتا اور جن کے لیے بچوں کی حیثیت محض فضول لونڈوں کی سی ہو سکتی ہے- اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہے کہ جب حکام اساتذہ کی آزادی میں دخل دیتے ہیں تو عموماً یہ بات نقصان دہ ثابت ہوتی ہے- دوسرے شعبوں کا حال بھی یہی ہے- قوت ان لوگوں کے پاس ہوتی ہے جو مالی وسائل پر حاوی ہوتے ہیں- قوت ان لوگوں کے پاس نہیں جو ان امور کا علم رکھتے ہیں جن پر یہ وسائل خرچ کیے جاتے ہیں- یوں اہلِ قوت عموماً بے خبر اور بدخواہ ہوا کرتے ہیں وہ اپنے اختیارات جس قدر کم استعمال کریں' اتنا ہی اچھا ہوتا ہے-

مجبوری کا معاملہ وہاں شدید ترین ہوتا ہے جہاں مجبور کیا جانے والا شخص مجبوری کو اخلاقی رنگ دے دیتا ہے' حالانکہ اگر اس کے لیے ممکن ہوا تو وہ اس بات کو نظر انداز کر دیتا جس کو وہ اپنا فرض قرار دیتا ہے- ہم سب محصول ادا کرتے ہیں چاہے ہمیں سڑکیں نہ مہیا کی جائیں- یہ اور بات ہے کہ کوئی ایسا معجزہ ہو جائے کہ محصول جمع کرنے والے کو ہم نظر ہی نہ آئیں تو ہم بھی اسے اپنے وجود سے آگاہ نہ کریں گے- اسی طرح کوکین کی

ممانعت کو ہم سب قبول کر لیتے ہیں' جب کہ شراب پر پابندی کا معاملہ مشکوک رہتا ہے۔

بہرحال بہترین مثال بچوں کی ہے۔ بچوں کو اتھارٹی کی نگران میں رکھنا لازم ہے۔ بچے خود بھی اس بات سے آگاہ ہیں' اگرچہ کبھی کبھار وہ بغاوت کا کھیل رچانا پسند کرتے ہیں۔ بچوں کا معاملہ اس لحاظ سے عجیب وغریب ہے کہ جن بچوں پر اتھارٹی موجود ہوتی ہے' وہ بسا اوقات اسے پسند کرنے لگتے ہیں۔ جہاں کہیں یہ صورت حال ہو' وہاں بچے عام طور پر اتھارٹی کے خلاف رنجیدگی کا اظہار نہیں کرتے' البتہ خاص خاص موقعوں پر اس کی مزاحمت ضرور کرتے ہیں۔

اساتذہ کے برخلاف تعلیمی حکام ایسی خوبی سے محروم ہیں۔ یہ حکام ملک وقوم کی بہتری کی خاطر بچوں کو حب الوطنی کا درس لینے پر مجبور کرتے ہیں۔ یہ حب الوطنی اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ معمولی باتوں کی خاطر قتل کرنے یا قتل ہونے کی خواہش پیدا کی جائے۔ اتھارٹی اگر ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہو جو اپنے ماتحتوں کے خیر خواہ ہیں تو پھر اتھارٹی نسبتاً بے ضرر ہوا کرتی ہے۔ تاہم یہ نتیجہ حاصل کرنے کا کوئی بھی معلوم طریقہ کار نہیں ہے۔

جبر اس وقت بدترین ہوا ہے جب اس کا نشانہ بننے والے کو یقین ہو کہ جس کام کا اسے حکم دیا جا رہا ہے وہ غلط یا نقصان دہ ہے کسی مسلمان کو سور کا گوشت یا کسی ہندو کو گائے کا گوشت کھانے پر مجبور کرنا نفرت انگیز اور مکروہ ہے۔ جو لوگ چیچک کا ٹیکہ لگانے کے مخالف ہیں' انہیں یہ ٹیکہ نہیں لگانا چاہیے۔ البتہ ان کے چھوٹے بچوں کا معاملہ مختلف ہے۔ بچوں کی زندگی بچانے کے لیے انہیں ٹیکہ لگنا ہی چاہیے۔

آزادی کے اس معاملے میں اہم ترین فرق دو قسم کی نیکیوں میں ہے۔ ایک طرف وہ نیکیاں ہیں جن کو کوئی شخص دوسروں کی قیمت پر قبول کئے رکھتا ہے۔ دوسری طرف ایسی نیکیاں ہیں جن میں ایک شخص کا فائدہ دوسر کا نقصان نہیں ہے۔ اگر میں اپنے جائز حصے سے زیادہ خوراک چٹ کر جاتا ہوں تو کوئی دوسرا شخص بھوکا رہ جاتا ہے لیکن اگر میں ریاضی کا بہت زیادہ مطالعہ کرتا ہوں تو اس سے کسی کو نقصان نہیں پہنچتا بشرطیکہ میں تعلیمی مواقع پر اپنی اجارہ داری قائم نہ کرلوں۔ ایک اور نکتہ بھی یہاں غور طلب ہے۔ روٹی' کپڑا مکان زندگی کی ضروریات میں اور اس بارے میں لوگوں میں زیادہ اختلاف نہیں ہے لہٰذا جمہوری نظام میں حکومت کو ان کے معاملے میں دخل اندازی کا حق ہونا چاہیے۔ ایسے

سارے معاملات میں انصاف کو بالادستی حاصل ہونی چاہیے- جدید جمہوری معاشرے میں انصاف کا مطلب مساوات ہے- تاہم ایسے معاشرے میں اس کا مطلب مساوات نہ ہوگا جس میں طبقوں کی درجہ بندی ہو اور نچلے اور بالائی دونوں طبقوں والے اسے قبول نہ ہوں- جدید انگلستان میں بھی اگر یہ تجویز پیش کی جائے کہ بادشاہ کی شان وشوکت ایک عام مزدور سے زیادہ نہ ہونی چاہیے تو بہت سے مزدوروں کو بھی اس سے رنج پہنچے گا- لہٰذا میں چاہتا ہوں کہ انصاف کی تعریف یوں کی جائے کہ اس سے مراد کم سے کم حسد پیدا کرنے والا نظام ہے-ضعیف الاعتقادی سے پاک معاشرے میں اس کا مطلب برابری ہوگا- تاہم سماجی نابرابری میں ایمان رکھنے والے معاشرے میں معاملہ الٹ ہوگا-

خیر، جہاں تک رائے، فکر، آرٹ وغیرہ کا تعلق ہے ان میں ایک شخص اپنی کامیابیاں دوسروں کی قیمت پر حاصل نہیں کرتا- مزید برآں شعبے میں اچھائی کا تعین بھی مشکوک ہے- اگر الف عیش اڑا رہا ہے اور ب روکھی سوکھی روٹی سے پیٹ کی آگ بجھا رہا ہے، تو الف کی طرف افلاس کے فائدے پر وعظ ریاکاری ہوگی- لیکن اگر مجھے ریاضی پسند ہے اور آپ موسیقی کے رسیا ہیں تو ہم ایک دوسرے کے معاملے میں دخل نہیں دیتے اور جب ہم ایک دوسرے کے ذوق کی داد دیتے ہیں تو شائستگی کا اظہار کرتے ہیں- جہاں تک رائے کا معاملہ ہے، صداقت تک پہنچنے کا واحد راستہ مقابلہ ہے-لبرل ازم کے پرانے حامیوں سے غلطی ہوئی ہے- وہ کاروبار میں آزاد مقابلے کا پرچار کرتے رہے ہیں، جب کہ انہیں خیالات کی دنیا میں آزاد مقابلے کی حمایت کرنی چاہیے تھی- ہم بھی کاروبار کے بجائے خیالات کی دنیا میں آزاد مقابلہ چاہتے ہیں-مشکل یہ ہے کہ کاروبار میں آزاد مسابقت ختم ہوتی ہے تو فاتحین اپنی معاشی قوت کو ذہنی اور اخلاقی شعبوں میں زیادہ سے زیادہ استعمال کرنے کے درپے ہو جاتے ہیں- وہ روزی کمانے کی اجازت کو راست زندگی اور راست سوچ سے مشروط کرنے پر زور دیتے ہیں- یہ بدقسمتی کی بات ہے، کیونکہ راست زندگی کا مطلب ریاکاری اور راست سوچ کا مطلب بے وقوفی ہے-سب سے بڑا خطرہ یہ ہے کہ آیا امراء کی حکومت یا اشتراکی نظام میں معاشی ایذارسانی کے ذریعے تمام ذہنی اور اخلاقی ترقی محال ہو جائے گی- فرد کی آزادی کا احترام وہاں ہونا چاہیے جہاں کے اعمال سے دوسروں کو کوئی براہِ راست، واضح اور غیر مشکوک نقصان نہیں پہنچتا-

بصورتِ دیگر ہماری ایذا رساں جبلتیں سولہویں صدی کے سپین جیسی ایک ہی دھڑے پر چلنے والا معاشرہ تعمیر کر دیں گی- یہ خطرہ حقیقی ہے اور ہم بھی- اگر ہم نے آزادی کو اس کے مناسب مقام پر رکھنا نہ سیکھا تو پھر اس خطرے سے دوچار ہوئے بغیر نہ رہیں گے-ہمیں ایسی آزادی کی خواہش نہ کرنی چاہیے جو دوسروں کو دبانے والی ہو بلکہ ہمیں ایسی آزادی تلاش کرنی چاہیے جو ہمیں اپنی مرضی کے مطابق رہنے اور سوچنے کا حق دے اور ہمارے اس حق سے دوسروں کو نقصان نہ پہنچے-

آخر میں میں اس شے کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں جس کو اس مضمون کے آغاز میں ''نفسیاتی حرکیات کا نام دیا گیا تھا- جس معاشرے میں ایک ہی قسم کا کریکٹر ملتا ہو' اس میں مختلف قسم کے کریکٹر رکھنے والے معاشرے کے مقابلے میں زیادہ آزادی ممکن ہو سکتی ہے- انسانوں اور شیروں پر مشتمل معاشرے میں آزادی خطرے میں رہتی ہے' کیونکہ وہاں شیروں کو پابند سلاسل کرنا پڑتا ہے یا پھر انسانوں کو- اس طرح دنیا میں جس جگہ رنگ دار لوگوں پر سفید فام حکمران ہیں' وہاں آزادی ممکن نہیں- زیادہ سے زیادہ آزادی کو ممکن بنانے کے لیے تعلیم کے ذریعے کردار سازی ضروری ہے تاکہ انسان ایسی سرگرمیوں سے خوشی حاصل کرنا سیکھ سکیں جو دوسروں کو دبانے والی نہیں ہے-کردار سازی میں موثر کام زندگی کے پہلے چھ برسوں میں ہوتا ہے- ڈیپٹ فورڈ میں مس میکملن بچوں کی اس طرح تربیت کر رہی ہیں کہ وہ آزاد معاشرے تخلیق کرنے کے قابل بن جاتے ہیں- اگر مس صاحبہ کے طریقوں کا اطلاق امیر غریب تمام بچوں پر کیا جائے تو محض ایک نسل ہمارے تمام سماجی مسائل حل کرنے کے لیے کافی ہوگی- تاہم تربیت پر اصرار کے سبب تمام فریق یہ بات بھول گئے ہیں کہ تعلیم میں اہم شے کیا ہوتی ہے- بچپن گزرنے کے بعد خواہشوں کو کنٹرول تو کیا جا سکتا ہے لیکن انہیں بدلا نہیں جا سکتا- لہٰذا یہ ضروری ہے کہ انسانوں کو بچپن ہی میں زندہ رہو اور زندہ رہنے دو'' کا سبق سکھایا جائے- انسان اگر ایسی چیزوں کی خواہش نہ کرنے لگیں جن کو صرف دوسروں کی بدقسمتی کے ذریعے حاصل کیا جا سکتا ہے تو پر سماجی آزادی کی راہ میں حائل رکاوٹیں بھی ختم ہو جائیں گی-

خوش باش شخص

مسرت کا دارومدار کسی حد تک بیرونی حالات پر ہوتا ہے اور کسی حد تک خود فرد پر۔ جہاں تک فرد کے حصے کا تعلق ہے، مسرت کا حصول مشکل نہیں، بہت سے لوگ سمجھتے ہیں کہ مذہب سے ملتے جلتے کسی عقیدے کے بغیر مسرت حاصل نہیں کی جاسکتی۔ رنجیدہ رہنے والے بہت لوگوں کا خیال ہے کہ اُن کے رنج والم کے اسباب پیچیدہ اور ذہنی قسم کے ہیں۔ لیکن میں ان سے متفق نہیں۔ میرا نہیں خیال کہ اس قسم کے اُمور مسرت یا رنج کے حقیقی اسباب ہیں۔ میرے نزدیک تو وہ صرف علامتیں ہیں۔ ہوتا یوں ہے کہ رنجیدہ رہنے والا شخص عموماً کسی المناک عقیدے کو قبول کر لیتا ہے اور خوش باش رہنے والا مسرت افزا عقیدہ اپنا لیتا ہے۔ پھر دونوں مسرت و رنج کو اپنے اپنے عقیدوں سے وابستہ کرنے لگتے ہیں، جب کہ معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔

اکثر لوگوں کی مسرت کے لیے بعض اشیا ضروری ہیں مگر وہ بہت سادہ قسم کی اشیا ہیں۔ اس فہرست میں روٹی، مکان، صحت، محبت، کامیاب کام اور اپنے گروہ کا احترام شامل ہیں۔ بعض لوگوں کے لیے بال بچوں کا ہونا بھی لازمی ہے۔ ان چیزوں کی غیر موجودگی میں کوئی خاص قسم کا شخص ہی خوش باش رہ سکتا ہے۔ لیکن جب خوشی کے یہ لوازمات موجود ہوں یا انہیں مناسب کوشش سے حاصل کیا جاسکتا ہو اور اس کے باوجود کوئی شخص رنج والم کا شکار رہے تو پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کسی نفسیاتی عدم مطابقت کا مریض ہے۔ عام صورت میں اس قسم کا مریض اپنا علاج خود کر سکتا ہے۔ ہاں، اگر مرض میں شدت ہو تو کسی نفسیاتی معالج کی خدمت حاصل کرنی ہوگی۔

خارجی حالات اگر زیادہ ناخوش گوار نہ ہوں تو پھر آدمی کو خوشی حاصل کرنے کے قابل ہونا چاہیے۔ شرط بس یہ ہے کہ اُس کے جذبوں اور دلچسپیوں کا رخ باطن کے بجائے خارج کی طرف ہو۔ لہٰذا تعلیم کے معاملے میں اور دنیا کے ساتھ ہم آہنگی کی کوششوں میں ہمارا مطمع نظر یہ ہونا چاہیے کہ ہم اپنی ذات کو مرکز بنانے والے جذبوں سے

گریز کریں اور ان دلچسپیوں کی طرف راغب ہوں جو ہمارے خیالات کو ہمیشہ محض ہماری ذات کے گرد گھومنے سے بچائیں۔ اکثر لوگوں کی فطرت یہ نہیں کہ وہ بندی خانے میں خوش باش رہ سکیں۔ اپنی ذات تک ہمیں محدود کرنے والے جذبے بدترین بندی خانے بناتے ہیں۔ اس قسم کے جذبوں میں خوف، حسد، احساس گناہ اور اپنی تعریف کرنے کے جذبے زیادہ عام ہیں۔ ان سب میں ہماری توجہ اپنی ذات تک محدود رہتی ہے۔ بیرونی دنیا میں کوئی حقیقی دلچسپی باقی نہیں رہتی۔ بس یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ بیرونی دنیا کہیں ہمیں نقصان نہ پہنچائے یا ہماری خودی کو ٹھیس نہ لگائے۔

یہ زیادہ تر خوف کے سبب ہوتا ہے کہ لوگ حقائق سے نظریں چُراتے ہیں اور اپنے گرد پردے تان لینے پر آمادہ رہتے ہیں لیکن حقیقتوں کے کانٹے ان پردوں کا دامن چاک کر دیتے ہیں۔ یوں پناہ کی تلاش میں اُن کے پیچھے چھپے ہوئے شخص کو اُس فرد کے مقابلے میں کہیں زیادہ تکلیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے جو ابتدا ہی سے جرأت مندی کے ساتھ حقائق کو تسلیم کرنے کی راہ اپناتا ہے۔ بات یہ بھی ہے کہ اپنے آپ کو فریب دینے والے عموماً دل کی گہرائیوں میں اپنے کرتوت سے آگاہ ہوتے ہیں لہٰذا ہر وقت انہیں خدشہ رہتا ہے کہ کوئی ناگوار واقعہ انہیں ناپسند حقائق کو تسلیم کرنے پر مجبور نہ کر دے۔

اپنی ذات کو مرکز بنانے والے زندگی میں تنوع پیدا نہیں ہونے دیتے، مانا کہ صرف اپنے آپ سے محبت کرنے والے کو ہرجائی ہونے کا طعنہ نہیں دیا جا سکتا۔ لیکن آخر کار اُسے ایک ہی شے سے یعنی اپنی ذات سے چمٹے رہنے سے پیدا ہونے والی ناقابل برداشت بوریت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ احساس گناہ کا شکار فرد بھی اصل میں ایک خاص قسم کی خود پرستی کا مریض ہوتا ہے۔ اس عظیم الشان کائنات میں اُسے اہم ترین بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ بس وہ خود پارسا ہو۔ روایتی مذہب کی بعض صورتوں کی ایک اہم برائی یہ ہے کہ انہوں نے اس قسم کی خود پرستی کی حوصلہ افزائی کی ہے۔

خوش باش شخص وہ ہوتا ہے جس کی چاہتوں اور دلچسپیوں میں تنوع ہوتا ہے۔ ان کے ذریعے وہ اپنی خوشیاں سمیٹتا ہے۔ پھر یہ بھی ہوتا ہے کہ ان کے ذریعے وہ بہت سے دوسرے لوگوں کی چاہت اور دلچسپی کا مرکز بن جاتا ہے۔ دوسروں کی چاہت اور دلچسپی کا معروض بننا حصول مسرت کا ایک زبردست منبع ہے لیکن دوسروں سے چاہت کا مطالبہ کرنے والا اُس سے محروم رہتا ہے۔ عام طور پر چاہت اُسے ملتی ہے جو دوسروں کو چاہت

دینے والا ہوتا ہے۔ ہاں، یاد رکھنے والی بات یہ ہے کہ لین دین کاروباری طرز کا نہیں۔

اچھا تو پھر اُس شخص کو کیا کرنا چاہیے جو اپنی ذات کے خول میں بند ہونے کے سبب خوشیوں سے محروم ہے؟ جب تک وہ اپنی رنجیدگیوں کے بارے میں سوچتا رہتا ہے، تب تک وہ اپنی ذات کے حصار میں محصور رہتا ہے۔ یوں وہ اس چکر سے باہر نہیں نکل سکتا۔ وہ صرف حقیقی دلچسپیوں کی مدد سے باہر قدم نکال سکتا ہے۔ دوا کے طور پر اختیار کی جانے والی جھوٹ موٹ کی دلچسپیاں اُس کے کام نہیں آسکتیں۔ یہ مشکل حقیقی سہی، لیکن اگر اُس نے اپنے مسئلے کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے تو پھر وہ بہت کچھ کرسکتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شعوری یا لاشعوری احساس گناہ اُس کے مصائب کا سبب ہے تو پہلے وہ اپنے شعوری ذہن کو قائل کرسکتا ہے کہ اس احساس کا کوئی جواز نہیں ہے۔ بعدازاں وہ اس اعتراف کو اپنے لاشعوری ذہن میں بٹھا سکتا ہے۔ دریں اثناء وہ بعض کم و بیش بے تعلق قسم کی دلچسپیوں میں حصہ لے سکتا ہے۔ اگر وہ حساس گناہ سے نجات پانے میں کامیاب ہو جائے تو غالباً حقیقی معروضی دلچسپیاں خود بخود پیدا ہونے لگیں گی۔ خودترسی کا شکار ہونے کی صورت میں وہ اس طریقے سے نجات حاصل کرسکتا ہے۔ اُسے اپنے آپ کو یہ یقین دلانا ہوگا کہ اُس کے حالات میں کوئی غیر معمولی بدقسمتی کارفرما نہیں ہے۔

اسی طرح مسئلہ اگر خوف کا ہو تو اُسے ایسی مشقیں کرنی چاہیں جو حوصلہ اور جرأت دینے والی ہوں۔ زمانہ قدیم ہی سے حالت جنگ میں جرأت کے مظاہرے کو اہم خوبی خیال کیا جاتا ہے اور نوجوانوں کی تربیت کا بڑا حصہ جنگ میں بے خوفی سے کام لینے والا کردار پیدا کرنے سے تعلق رکھتا ہے البتہ اخلاقی جرأت اور ذہنی جرأت کا مطالعہ کم ہی کیا گیا ہے۔ بہرحال ان کو پیدا کرنے کے اپنے طریقے ہیں۔ اگر آپ ہر روز کم از کم ایک ناگوار سچائی کا اعتراف کرنے لگیں تو دیکھیں گے کہ یہ طریقہ کار اتنا ہی مفید ہے جتنا کسی بوائے سکاٹ کا ہمدردانہ فعل ہوا کرتا ہے۔ اپنے آپ کو سمجھائیے کہ اگر آپ اپنے تمام دوستوں سے نیکی اور ذہانت کے لحاظ سے بے حد بہتر نہ ہوتے، جیسا کہ آپ ہیں، تو بھی زندگی زندہ رہنے کے قابل ہی ہوتی۔ برسوں تک اس قسم کی مشق کرنے سے آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ کسی تردد کے بغیر حقائق کا سامنا کرسکیں۔ یوں بہت سے خوفوں سے نجات مل جائے گی۔

جب آپ اپنے آپ میں مگن رہنے کے روگ پر قابو پالیں گے تو پھر معروضی دلچسپیوں کا معاملہ آپ اپنی فطرت اور حالات کے بے ساختہ عمل پر چھوڑ سکتے ہیں۔ خود سے

یہ نہ کہیے کہ اگر میں ٹکٹ جمع کرنے لگوں تو اس مشغلے سے مجھے خوشی حاصل ہو جائے گی۔ یہ نہ ہو کہ آپ خوشی کی امید پر ٹکٹ جمع کرنے میں جُت جائیں اور اس سے کوئی خوشی حاصل نہ ہو۔ صرف وہی بات آپ کے لیے مفید ہو سکتی ہے جس میں آپ کو حقیقی دلچسپی ہو۔ بہر حال آپ یہ یقین ضرور کر سکتے ہیں کہ جب آپ اپنی ذات کے حصار سے قدم باہر نکالیں گے تو حقیقی معروضی دلچسپیاں بھی نمایاں ہو جائیں گی۔

خوش باش زندگی ہی اصل میں غیر معمولی حد تک اچھی زندگی ہے۔ پیشہ ور معلمین اخلاق نے کسر نفسی کا بہت چرچا کیا ہے۔ اس طرح وہ غلط جگہ پر دباؤ ڈالتے رہے ہیں۔ ذات کی نفی کرنے کی کوشش شعوری طور پر کی جائے تو پھر فرد اپنی ذات میں سمٹ جاتا ہے۔ ہر وقت اُس کے ذہن پر یہ خیال چھایا رہتا ہے کہ اُس نے کون کون سی قربانیاں دی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کوشش سے فوری مقصد حاصل کرنے میں اکثر ناکامی ہوتی ہے اور جہاں تک اُس کے حتمی مقاصد کا تعلق ہے، وہ کم و بیش ہمیشہ ہی حاصل نہیں ہوتے۔ ضرورت کسر نفسی کی نہیں بلکہ اپنی ذات سے باہر دلچسپیوں کی سمت متعین کرنے کی ہے جو بے ساختہ اور فطری انداز میں ویسے ہی اقدامات کی طرف لے جاتی ہیں جیسے اقدامات اپنی خوبی کی جستجو میں ڈوبا ہوا شخص شعوری کسر نفسی کے وسیلے سے کر سکتا ہے۔

بظاہر یہاں میرا رویہ لذت پرست جیسا ہے، یعنی میں مسرت کو اچھائی کا درجہ دیتا ہوں۔ لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ لذت پرست کے نقطہ نظر سے جن اقدامات کی سفارش کی جاتی ہے وہ عموماً وہی ہیں جن کی سفارش کوئی دانا اخلاق پرست کر سکتا ہے۔ یہ بات ہمیشہ درست نہ سہی پھر بھی ہوتا یہ ہے کہ اخلاق پرست کر سکتا ہے۔ یہ بات ہمیشہ درست نہ سہی پھر بھی ہوتا یہ ہے کہ اخلاق پرست ذہن کی کیفیت کے بجائے عمل پر زیادہ زور دیتا ہے۔ کسی عمل کے اثرات عمل کرنے والے کے اُس لمحے کی ذہنی کیفیت کے حوالے سے مرتب ہوتے ہیں۔ مثلاً کسی بچے کو ڈوبتے دیکھ کر مدد کرنے کی خواہش کے تحت آپ اُسے بچالیں تو اُس عمل کی اخلاقی حیثیت کو کوئی ضعف نہ پہنچے گا۔ لیکن اگر آپ بچے کو ڈوبتا دیکھ کر خود سے یہ کہیں کہ ''کسی بے بس کی مدد کرنا نیکی ہے اور میں نیک بننا چاہتا ہوں۔ لہٰذا لازم ہے کہ اس بچے کی جان بچاؤں'' تو پھر آپ سے بدتر فرد ہوں گے۔ اس انتہائی معاملے میں جو بات درست ہے، وہ بہت سے دوسرے قدرے غیر واضح معاملات میں بھی درست ہے۔

زندگی سے متعلق میرے اور روایتی اخلاق پرستوں کے رویوں میں ایک اور

فرق بھی ہے، جو قدرے لطیف ہے۔ مثال کے طور پر روایتی اخلاق پرست یہ کہیں گے کہ محبت کو بے غرض ہونا چاہیے۔ ایک لحاظ سے وہ درست کہتے ہیں۔ یعنی محبت کو ایک حد سے زیادہ خودغرض نہ ہونا چاہیے۔ لیکن یہ تو ہے کہ محبت کرنے والے کی مسرتیں اُس کی کامیابی سے منسلک ہونی چاہئیں۔ اگر کوئی شخص کسی خاتون سے محض اس لیے شادی کرنا چاہتا ہے کہ وہ اس خاتون کی خوشیوں کا خواہش مند ہے اور ساتھ ہی ساتھ سمجھتا ہے کہ بیوی بن کر وہ اسے ذات کی قربانی کے بہترین مواقع فراہم کرے گی تو پھر میرے خیال میں اس امر پر شبہ کیا جا سکتا ہے کہ آیا یہ بات اُس خاتون کے لیے خوشی کا باعث ہوگی۔

بلاشبہ ہمیں اپنے پیاروں کی خوشیوں کی خواہش کرنی چاہیے لیکن یہ خواہش ہماری اپنی مسرتوں کے متبادل کے طور پر نہ ہونی چاہیے۔ اصل میں ذات اور باقی دنیا میں پایا جانے والا تضاد، جو کسر نفسی کے نظریے میں مضمر ہے، اُس لمحے ختم ہو جاتا ہے جب ہم اپنی ذات کے حصار سے نکل کر افراد یا اشیاء میں کوئی حقیقی دلچسپی لیتے ہیں۔ اس قسم کی دلچسپیوں کے حوالے سے فرد اپنے آپ کو زندگی کے بہاؤ کا حصہ محسوس کرنے لگتا ہے اور اُس کی حیثیت الگ تھلگ پڑے رہنے والے کسی پتھر جیسی نہیں رہتی۔

رنج والم کسی نہ کسی عدم ہم آہنگی سے جنم لیتے ہیں۔ ذات میں یہ صورت حال اس وقت پیدا ہوتی ہے جب شعوری اور لاشعوری ذہن میں ہم آہنگی نہ ہو۔ ذات اور معاشرے میں عدم ہم آہنگی اُس وقت جنم لیتی ہے جب دونوں معروض دلچسپیوں اور محبتوں کی قوت سے آپس میں بندھے نہ ہوں۔ خوش باش فرد وہ ہوتا ہے جو ہم آہنگی کی ان دونوں میں سے کسی ایک کی ناکامی کا شکار نہیں ہوتا۔ اُس کی ذات میں ہم آہنگی ہوتی ہے اور دنیا کے ساتھ بھی۔ ایسا فرد اپنے آپ کو کائنات کا باسی محسوس کرتا ہے۔ وہ اُس کے نظاروں سے اُس کی مسرتوں سے لطف اندوز ہوتا ہے اور موت کے تصور سے بے نیاز ہوتا ہے، کیونکہ وہ خود کو بعد میں آنے والوں سے الگ تھلگ خیال نہیں کرتا۔ زندگی کے بہاؤ کے ساتھ اس قسم کی گہری جبلی وحدت میں ہی عظیم ترین مسرت مضمر ہے۔

محبت اور زندگی

اکثر معاشروں میں محبت کے بارے میں دو مختلف رویے رائج ہیں۔ ایک طرف تو محبت شاعری، ناولوں اور ڈراموں کا بنیادی موضوع ہے تو دوسری طرف اکثر سنجیدہ ماہرین عمرانیات اسے مکمل طور پر نظر انداز کرتے ہیں اور اسے معاشی اور سیاسی اصلاح کے ایجنڈے میں جگہ نہیں دی جاتی۔ میرے نزدیک یہ رویہ جائز نہیں ہے۔ میرے خیال میں محبت انسانی زندگی کی اہم ترین چیزوں میں سے ایک ہے اور میں ہر اُس نظام کو ناپسندیدہ سمجھتا ہوں جو اس کی آزادانہ نشوونما میں غیر ضروری رکاوٹیں پیدا کرتا ہے۔

محبت کے لفظ کو مناسب طور پر استعمال کیا جائے تو وہ مرد اور عورت کے تمام باہمی رشتوں کی نشاندہی نہیں کرتا بلکہ وہ صرف ایک رشتے کی خبر دیتا ہے جس میں بہت سا جذبہ شامل ہوتا ہے اور جو نفسیاتی اور جسمانی دونوں قسم کا رشتہ ہے۔ اس کی شدت بے انت ہے۔ محبت کے جذبے کو فنی اظہار عطا کرنے کی صلاحیت عام نہیں لیکن خود اس جذبے کی، کم از کم براعظم یورپ میں، فراوانی ہے۔ بعض معاشروں میں یہ جذبہ زیادہ اور بعض میں کم ملتا ہے۔ اس امر کا انحصار متعلقہ افراد پر نہیں بلکہ رسوم ورواج اور اداروں پر ہے۔ مثال کے طور پر چین میں محبت کا جذبہ بہت ہی کم ملتا ہے اور تاریخ میں بھی یہ اُن بدکار چینی شہنشاہوں کے وصف کے طور پر سامنے آتا ہے جن کو داشتاؤں نے بگاڑ دیا تھا۔ روایتی چینی کلچر میں تمام شدید جذبوں کو ناپسند کیا جاتا تھا اور فرد کو ہر قسم کے حالات میں عقل کی بالادستی قائم رکھنے کی تلقین کی جاتی تھی۔

اہل یورپ کا معاملہ مختلف ہے۔ اپنی تاریخ میں وہ رومانی تحریک، انقلاب فرانس اور عظیم جنگوں کے تجربے سے گزرے ہیں، اس لیے وہ خوب جانتے ہیں کہ انسانی زندگی میں فہم ودانش کا کردار اُس قدر غالب نہیں جس قدر کہ ملکہ این کے زمانے میں خیال کیا جاتا تھا۔ تحلیل نفسی کے نظریے کی تخلیق کر کے فہم و دانش نے خود اپنے خلاف سرکشی کو مزید فروغ دیا ہے۔ جدید زندگی میں تین اہم ماورائے عقل سرگرمیاں مذہب، جنگ اور

محبت ہیں۔ تاہم محبت عقل دشمن نہیں ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ کوئی معقول شخص بھی محبت سے معقول انداز میں لطف اندوز ہوسکتا ہے، بعض وجوہ کی بنا پر دنیائے جدید میں محبت اور مذہب میں کشاکش جاری ہے۔ یہ کشاکش ایسی نہیں کہ اُس سے چھٹکارا نہ پایا جاسکے۔ اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ بعض دوسرے مذاہب کے برعکس عیسائیت کی جڑیں رہبانیت میں پیوست ہیں۔

خیر، آج کی دنیا میں محبت کا ایک اور دشمن بھی ہے جو مذہب سے زیادہ خطرناک ہے۔ یہ دشمن محنت اور معاشی کامیابی کی لگن ہے۔ خاص طور پر امریکہ میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ محبت کو کیریئر میں دخل اندازی کی اجازت نہیں دینی چاہیے اور اگر کوئی شخص محبت کو اپنے کیریئر پر اثر انداز ہونے کا موقع دیتا ہے تو وہ احمق ہے۔ تاہم دیگر تمام انسانی معاملات کی طرح اس معاملے میں بھی توازن ضروری ہے۔ محبت کی خاطر کیریئر کو مکمل طور پر قربان کرنا احمقانہ بات ہے، گو بعض صورتوں میں یہ المناک انداز میں ہیروانہ ہوسکتی ہے۔ پھر بھی اس قسم کے واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ آج کے کسی بزنس مین اور خاص طور پر امریکی بزنس مین کی زندگی پر نگاہ ڈالیے۔ عنفوان شباب ہی سے وہ اپنے تمام بہترین خیالات اور ساری بہترین صلاحیتیں مال و زر کمانے کے لیے وقف کیے ہوتا ہے۔ اس کے نزدیک دنیا کی دوسری تمام چیزیں فضول ہوتی ہیں۔ جوانی میں وہ اپنی جسمانی ضرورتیں وقتاً فوقتاً طوائفوں کے ذریعے پوری کرتا رہتا ہے۔ پھر وہ شادی کرتا ہے، لیکن اُس کی تمام دلچسپیاں اُس کی بیوی کی دلچسپیوں سے مختلف ہوتی ہیں اور بیوی کے ساتھ کبھی اس کی گہری قربت اور رفاقت پیدا نہیں ہوتی۔ دفتر سے وہ تھکا ہارا دیر سے آتا ہے اور صبح کو بیوی کے جاگنے سے پہلے اٹھ جاتا ہے، اتوار کا دن وہ گولف کھیلنے میں بسر کرتا ہے، کیونکہ روپیہ کمانے کی دوڑ جاری رکھنے کے لیے ورزش ضروری ہے۔ بیوی کی دلچسپیاں اُسے نسوانی باتیں دکھائی دیتی ہیں۔ ممکن ہے کہ وہ اُسے اچھی لگیں، لیکن وہ ان میں شراکت کی کوئی کوشش نہیں کرتا۔

اس بزنس مین کے پاس بیوی کی طرح کسی محبوبہ کے لیے بھی وقت نہیں ہوتا۔ ہاں، یہ ضرور ہے کہ جب وہ اپنے کام کے سلسلے میں گھر سے دور جاتا ہے تو کبھی کبھار کسی طوائف کا چکر لگا لیتا ہے۔ غالباً اُس کی بیوی جنسی طور پر اُس کے ساتھ سرد مہر رہتی ہے۔ یہ

کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔ اُس کے پاس بیوی کی ناز برداریوں کے لیے فرصت ہی نہیں ہوتی۔ لاشعوری طور پر وہ غیر مطمئن رہتا ہے، تاہم اس کا سبب اُس کی سمجھ میں نہیں آتا۔ وہ اپنی بے چینی سے نجات کے لیے کام پر زیادہ سے زیادہ وقت دیتا ہے یا اس سے چھٹکارا پانے کے لیے دوسرے طریقے تلاش کرتا ہے۔ اُس کی بیوی بھی بے چینی کا شکار رہتی ہے۔ اس سے بچنے کے لیے وہ دوسرے درجے کی ثقافتی سرگرمیوں میں حصہ لیتی ہے۔

اس طریقے سے میاں بیوی دونوں کی جنسی تسکین حاصل کرنے میں ناکامی انسانوں سے نفرت میں ڈھل جاتی ہے۔ تاہم اس نفرت کو بہبود عامہ یا اعلیٰ اخلاقی معیاروں کا لبادہ اوڑھا دیا جاتا ہے۔ یہ ساری ناگوار صورت حال زیادہ تر ہماری جنسی ضروریات کے غلط تصور سے پیدا ہوتی ہے۔ بظاہر سینٹ پال اور دوسرے بزرگوں نے یہ فرض کر رکھا تھا کہ شادی کا مقصد صرف جنسی ملاپ کے لیے موقع فراہم کرنا ہے۔ مذہبی معلمین اخلاق نے بھی اپنی تعلیمات میں اس تصور کو ہوا دی ہے۔ جن سے ان کی نفرت نے جنسی زندگی کے تمام لطیف پہلو اُن کی نگاہوں سے اوجھل کر رکھے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس قسم کے معلیمن اخلاق کی تعلیمات سے بچپن میں متاثر ہونے والے لوگ زندگی بھر اپنے بہترین امکانات سے بے خبر رہتے ہیں۔ محبت محض جنسی ملاپ نہیں، یہ اُس سے بڑھ کر کوئی شے ہے۔ اصل میں محبت اُس تنہائی سے فرار کا بڑا وسیلہ ہے جو اکثر عورتوں اور مردوں پر زندگی کے زیادہ حصے میں چھائی رہتی ہے۔ اکثر لوگوں کے دل کی گہرائیوں میں بے حس دنیا اور دوسرے انسانوں کے ممکنہ جور وستم کا خوف بیٹھا رہتا ہے۔ وہ محبت کی تمنا کرتے ہیں۔ مردوں میں یہ تمنا روکھے پن اور بدتمیزی کے روپ میں چھپی رہتی ہے جب کہ عورتوں میں یہ خواہش جھاڑ پھٹکار اور نکتہ چینی کی عادت کا روپ دھار لیتی ہے۔ گہری باہمی محبت جب تک قائم رہتی ہے، وہ اس احساس کو ختم کیے رکھتی ہے۔ اگر محبت خودی کی پتھریلی دیواروں کو توڑ دیتی ہے۔ وہ ایک نئے وجود کو جنم دیتی ہے جس میں دو افراد ایک جان ہو جاتے ہیں۔ فطرت نے انسانوں کو تنہا رہنے کے لیے نہیں بنایا۔ ایک دوسرے کی مدد کے بغیر انسان فطرت کے حیاتیاتی مقصد کی تکمیل نہیں کر سکتے اور جہاں تک مہذب انسانوں کا تعلق ہے وہ اپنی جنسی جبلت کی بھرپور تسکین محبت کے بغیر نہیں کر سکتے۔ اس جبلت کی تسکین بھرپور انداز میں اُس وقت تک نہیں ہوتی جب تک جنسی ملاپ میں انسان کا

ذہن اور جسم دونوں شریک نہ ہوں۔ وہ تمام لوگ زندگی کے بہترین لطف سے محروم رہ گئے ہیں جن کو باہمی مسرت انگیز محبت کی گہری رفاقت اور جذبے کا تجربہ نہیں ہوا۔ شعوری یا لاشعوری طور پر وہ اپنی اس محرومی کو محسوس بھی کرتے ہیں۔ یوں مایوسی اور ناکامی کا احساس پیدا ہوتا ہے جو حسد اور جبر وظلم کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ یوں ہم دیکھتے ہیں کہ پُر جوش محبت کو اُس کا جائز مقام دینا ایک ایسا مسئلہ ہے جس میں ماہرین عمرانیات کو دلچسپی لینی چاہیے، وجہ یہ ہے کہ اس تجربے سے محروم رہنے والے مرد اور عورت اپنی ذات کی تکمیل نہیں کر سکتے اور نہ ہی ان میں دوسرے انسانوں، سماج اور دنیا کے بارے میں مثبت اور صحت مند جذبے پیدا ہو سکتے ہیں۔

حالات سازگار رہوں تو اکثر مردوں اور عورتوں کو زندگی کے کسی نہ کسی مرحلے پر جوشیلی محبت کا تجربہ ہوتا ہے تاہم غیر تجربہ کار لوگوں کو پُر جوش محبت اور محض جنسی کشش میں امتیاز کرنے میں دشواری پیش آتی ہے۔ یہ مشکل خاص طور پر اُن لڑکیوں کو پیش آتی ہے جن کی تربیت خاص طور پر ہوئی ہوتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ انہیں یہ درس دیا جاتا ہے کہ جب تک انہیں کسی مرد سے محبت نہ ہو، اُسے چومنا نہیں چاہیے اگر کسی لڑکی سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ شادی کے وقت تک وہ کنواری ہو تو پھر وہ عارضی اور لمحاتی جنسی کشش کے دام میں اکثر اوقات الجھتی رہے گی، حالانکہ جنسی طور پر تجربہ کار کوئی عورت اُسے آسانی سے محبت سے ممیّز کر سکتی ہے۔

بلاشبہ یہ امر غیر مسرت انگیز شادیوں کا بُرا سبب بنتا ہے۔ باہمی محبت اگر موجود ہو تو بھی یہ خیال اُسے زہر آلو کر دیتا ہے کہ یہ محبت گناہ آلود ہے۔ بسا اوقات اس احساس کا مناسب جواز موجود ہوتا ہے، لیکن یہ احساس بلا جواز ہو تو بھی محبت میں زہر بھرے بغیر نہیں رہتا۔ محبت کے تمام ثمرات سے لطف انداز ہونے کے لیے ضروری ہے کہ وہ آزاد، فیاض، بلا رکاوٹ اور پُر خلوص ہو۔

روایتی تعلیم محبت کو گناہ کے احساس سے آلودہ کر دیتی ہے۔ یہاں تک کہ ازدواجی محبت میں بھی عورتوں اور مردوں دونوں میں لاشعور طور پر یہ احساس پیدا ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ پرانی روایت سے منسلک رہنے والوں کے ساتھ ساتھ ایسے لوگ بھی اس کی زد میں آجاتے ہیں جو شعور کی سطح پر آزاد خیال ہوتے ہیں۔ اس رویے کے اثرات

مختلف قسم کے ہوتے ہیں۔ عموماً یہ اثرات مردوں کو جنسی اختلاط کے معاملے میں بے حس، بے ڈھنگا اور بے درد بنا دیتے ہیں، کیونکہ وہ عورت کے احساسات جاننے کے لیے اپنے اندر اس کے بارے میں بات کرنے کی ہمت نہیں پاتے اور نہ ہی وہ عورت کو جنس سے لطف اٹھانے کے بھرپور مواقع مہیا کر سکتے ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ اکثر اوقات احساس ہی نہیں ہوتا کہ عورت کو بھی اس ملاپ سے لطف اندوز ہونا چاہیے اور یہ کہ اگر وہ یہ لطف حاصل نہیں کر پاتی تو اس میں قصور اُس کے مرد کا ہے۔

روایتی تعلیم پانے والی عورتیں عموماً سرد مہری میں فخر محسوس کرتی ہیں۔ وہ جسمانی طور پر لیے دیئے رہتی ہیں اور جسمانی قرب کو آسانی سے قبول نہیں کرتی ہیں۔ ماہر مرد تو اُن کی کمزوریوں پر آسانی سے قابو پا لیتا ہے لیکن جو مرد اس رویے کو پاک بازی کی علامت خیال کرتا ہے اور اُس کا احترام کرتا ہے، وہ ناکام رہ جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ شادی کے کئی برس بعد میاں بیوی کے تعلقات میں کھچاؤ رہتا ہے اور وہ کم و بیش رسمی سے رہتے ہیں۔ ہمارے داداؤں کے زمانے میں شوہر کبھی اپنی بیویوں کو برہنہ دیکھنے کی اُمید نہ رکھتے تھے اور کبھی اگر وہ ایسی خواہش کا اظہار کر دیتے تو بیویوں کا ڈر کے مارے دم نکل جاتا۔ یہ رویہ آج بھی اُس سے زیادہ موجود ہے جتنا کہ ہم سمجھتے ہیں۔ اس حد کو پار کر جانے والے لوگوں کے رویوں اور طرز ہائے عمل میں بہت سی پرانی رکاوٹیں موجود ہیں۔

جدید دنیا میں محبت کی مکمل نشوونما میں ایک اور نفسیاتی رکاوٹ بھی موجود ہے۔ اس رکاوٹ کا تعلق بہت سے لوگوں کے اس خوف سے ہے کہ وہ اپنی انفرادیت برقرار نہیں رکھ سکتے۔ یہ ایک جدید اور احمقانہ خوف ہے۔ انفرادیت بجائے خود مقصد نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسی چیز ہے جس کو دنیا کے ساتھ بارآور رشتے میں شامل ہونا چاہیے اور اس عمل میں اپنی علیحدگی کو ختم کرنا چاہیے۔ جس انفرادیت کو شیشے کے صندوق میں بند کر دیا جاتا ہے، وہ مرجھا جاتی ہے۔ اس کے برعکس اگر اُس کو انسانی رشتوں میں آزادانہ شرکت کا موقع دیا جائے تو وہ پھلتی پھولتی ہے۔ محبت، بچے اور محنت فرد اور باقی دنیا کے درمیان ناطے کو مضبوط بنانے کے موثر ذرائع ہیں۔ ان میں سے محبت کو عموماً اولیت حاصل ہے۔ مزید برآں والدین کی شفقت کی بہترین نشوونما کے لیے بھی یہ لازمی ہے۔ بات یہ ہے کہ بچے تو ماں باپ دونوں کے نقش قدم پر ہی چلتے ہیں۔ ماں باپ اگر ایک دوسرے سے محبت نہیں کرتے

تو بچے میں باپ کی صفات نمایاں ہوں گی تو باپ خوش ہوگا اور ماں رنجیدہ ہوگی اور اگر ماں کی خصوصیات نمایاں ہوئیں تو ماں کو خوشی ہوگی اور باپ کو رنج ہوگا۔ یہ ضروری نہیں کہ محنت ہمیشہ بیرونی دنیا کے ساتھ فرد کا باثمر رشتہ قائم کرنے میں کامیاب ہو۔ اصل میں اس کا انحصار اس امر پر ہے کہ محنت کس انداز میں کی جاتی ہے۔ کام کاج اگر صرف روپے پیسے کی خاطر کیا جائے تو پھر اس قسم کا رشتہ نہیں بنا کرتا، ہاں اگر اس میں کوئی جاں نثاری، کوئی وابستگی--- مثلاً افراد سے، اشیا سے کسی وژن سے وابستگی--- شامل ہوتو یہ رشتہ قائم ہو سکتا ہے۔ محبت بھی اگر محض ملکیت کے احساس پر مبنی ہوتو وہ فضول ہوا کرتی ہے۔ جس قدر کا ہم یہاں ذکر کرتے ہیں وہ محبت میں صرف اُس وقت شامل ہوتی ہے جب دوسرے فرد کی شخصیت کو اپنی شخصیت جتنا اہم خیال کیا جائے اور دوسرے کے احساسات اور خواہشات کی اُسی طرح تکمیل کی جاتی ہے، گویا خودی کے احساس کی محض شعوری سطح پر نہیں بلکہ جبلی طور پر بھی یوں توسیع ہو کہ دوسرا فرد بھی اُس کا حصہ بن جائے۔ بے رحم مقابلے کے ہمارے معاشرے، پروٹسٹنٹ ازم سے اخذ شدہ احمقانہ شخصیت پرستی اور رومانوی تحریک نے مل کر اس قسم کی محبت کو دشوار بنا دیا ہے۔

جس سنجیدہ قسم کی محبت کا یہاں ہم ذکر کر رہے ہیں، وہ نئے دور کے آزاد خیال لوگوں کے ہاتھوں ایک نئے خطرے سے دوچار ہے۔ جنسی ملاپ کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہ ہے اور مادر پدر آزاد ہو جائے تو پھر جنس کا سنجیدہ جذبے اور چاہت کے احساس سے تعلق ٹوٹ جاتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اُس کا ربط نفرت کے جذبوں سے ہو جائے۔ آلڈوس ہکسلے کے ناولوں میں اس قسم کے معاملے میں واضح مثالیں ملتی ہیں۔ سینٹ پال کی طرح ھکسلے کے کردار بھی جنسی اختلاط کو محض فزیالوجیکل اخراج خیال کرتے ہیں اور وہ اُن اعلیٰ اقدار سے بے خبر دکھائی دیتے ہیں جن کے ساتھ اس اختلاط کو منسلک کیا جاسکتا ہے۔ رہبانیت اس سے صرف ایک قدم ہی آگے ہے، محبت کے اپنے مخصوص آدرش اور اخلاقی معیار ہیں جو مذہبی تعلیمات اور ہر قسم کی جنسی اخلاقیات کے خلاف نئی نسل میں خاصی حد تک مقبول ہونے والی بغاوت، دونوں میں دھندلا جاتے ہیں۔ جنسی ملاپ کو اگر محبت سے الگ تھلگ کر دیا جائے تو پھر وہ گہرے طور پر جبلت کی تسکین کرنے کے قابل نہیں رہتا۔ خیر، میں یہ نہیں کہتا کہ کسی شخصیت کی محبت کے بغیر جنسی ملاپ نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ اس صورت

میں ہمیں ایسی شرائط لاگو کرنا پڑیں گی کہ خود محبت بھی بہت دشوار ہو جائے گی ، میں بس یہ کہنا چاہتا ہوں کہ محبت کے بغیر جنسی ملاپ بہت کم قدر کا حامل ہے۔

انسانی زندگی میں موزوں مقام سے متعلق محبت کے دعوے بہت بڑے ہیں لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ محبت ایک نراجی قوت ہے۔ اگر اُسے آزاد چھوڑ دیا جائے تو وہ قانون یا رواج کی حدود میں بند نہیں رہتی۔ بچوں کا معاملہ نہ ہو تو پھر یہ کوئی بڑی بات نہیں۔ لیکن جونہی بچوں کا معاملہ شامل ہو جائے تو صورت حال یکسر بدل جاتی ہے کیونکہ اس صورت میں محبت خود مختار نہیں رہتی بلکہ نسل کے حیاتیاتی مقاصد کی تکمیل بن جاتی ہے۔ بلاشبہ بچوں کے بارے میں سماجی اخلاقیات کی ضرورت ہے جو کوئی تضاد پیدا ہونے کی صورت میں پُرجوش محبت کے تقاضوں کو مسترد کر سکے۔ تاہم ایک اچھا اخلاقی نظام ہو گا جو اس تضاد کو کم سے کم رکھ سکے، محض اس لیے نہیں کہ محبت بجائے خود اچھی چیز ہے بلکہ اس لیے بھی کہ ماں باپ ایک دوسرے سے محبت رکھتے ہوں تو یہ بات بچوں کے لیے اچھی ہوتی ہے۔ دانش مندانہ جنسی اخلاقی نظام کا ایک بڑا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ محبت میں اس قدر کم دخل اندازی کو یقینی بنایا جائے جو بچوں کے مفادات سے ہم آہنگ ہو۔

شادی

یہاں ہم بچوں کے حوالے کے بغیر محض عورت اور مرد کے مابین ایک تعلق کے طور پر شادی کو موضوع بحث بنائیں گے۔ دیگر جنسی تعلقات سے شادی اس لحاظ سے مختلف ہے کہ یہ ایک قانونی ادارہ ہے۔ اکثر معاشروں میں اسے مذہبی ادارے کی حیثیت بھی حاصل ہے۔ تاہم اس کا قانونی پہلو بنیادی ہے۔ قانونی ادارہ محض ایک ایسے رواج کی صورت گری کرتا ہے جو نہ صرف عہد قدیم کے انسانوں بلکہ بوزنوں اور کسی جانوروں میں پایا جاتا ہے جانوروں کی دنیا میں جہاں کہیں بچوں کی پال پوس کے لیے نر کا تعاون درکا ہو، وہاں نر اور مادہ میں ایسا رشتہ قائم ہوتا ہے جس کو ہم شادی کا عنوان دے سکتے ہیں۔ حیوانوں میں عام طور پر یک زوجگی کا رواج ہے اور بعض ماہرین کے نزدیک انسان نما بوزنوں میں یہ رواج خاص طور پر پایا جاتا ہے۔ اگر ماہرین کا یہ دعویٰ درست ہے تو گویا ان خوش قسمت حیوانوں کو وہ مسائل درپیش نہیں ہوتے جو انسانی معاشروں میں ہلچل مچائے رکھتے ہیں، کیونکہ جب کسی نر جانور کا تعلق اپنی مادہ سے بن جاتا ہے تو کوئی دوسری مادہ اُس میں دلچسپی نہیں لیتی۔ اس طرح جب کسی مادہ کا تعلق ایک نر سے بن جاتا ہے تو دوسروں کے لیے اُس میں کوئی کشش باقی نہیں رہتی۔ اس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ انسان نما بوزنے مذہب کے بغیر ہی گناہ سے محفوظ رہتے ہیں۔ ان میں خود جبلت ہی پاک بازی پیدا کردیتی ہے۔ اس امر کی تھوڑی بہت شہادت ملتی ہے کہ وحشی انسانوں کی کم ترین نسلوں میں بھی اس قسم کی صورت حال پائی جاتی ہے۔ مہذب انسانوں میں بھی کبھی کبھار یک زوجگی جبلت کے آثار دکھائی دے جاتے ہیں۔ کردار پر عادت کے اثر کو پیش نظر رکھا جائے تو شاید یہ بات حیران کن دکھائی دیتی ہے کہ جبلت پر یک زوجگی کا اثر زیادہ نہیں ہے۔ خیر، یہ انسانوں کے ذہنی امتیاز کی ایک مثال ہے اس سے صرف گناہ ہی جنم نہیں لیتے بلکہ ذہانت بھی ابھرتی ہے، کیونکہ ذہانت سے مراد تخیل کی قوت ہے جو عادتوں پر قابو پاکر طرز عمل کی نئی راہیں سامنے لاتی ہے۔

قدیم یک زوجگی کے رواج کو پہلے پہل غالباً معاشی محرک نے ضعف پہنچایا تھا۔

معاشی محرک جہاں کہیں جنسی کردار پر اثر انداز ہوتا ہے، اُس کے اثرات ہمیشہ تباہ کن ہوتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ وہ جبلت پر مبنی رشتوں کی جگہ غلامی اور خرید کے رشتوں کو نافذ کر دیتا ہے۔ قدیم زرعی اور چرواہوں کے گروہوں میں بیویاں اور بچے مرد کے لئے معاشی اثاثہ ہوا کرتے تھے۔ بیویاں اُس کے لئے کام کاج کرتی تھیں اور پانچ چھ برس کی عمر کے بعد بچے بھی اُس کا ہاتھ بٹانے لگتے تھے۔ اس لئے طاقتور مرد زیادہ سے زیادہ بیویاں حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ کسی معاشرے میں ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کا رواج عام صورت اختیار نہیں کرسکتا کیونکہ عورتوں کی تعداد عموماً مردوں سے بہت زیادہ نہیں ہوا کرتی۔ زیادہ بیویاں صرف سردار اور امیر لوگ ہی حاصل کر سکتے ہیں۔ زیادہ بیویاں اور بچے قیمتی جائیداد بن جاتے ہیں اس لئے وہ اپنے آقاؤں کی شان وشوکت میں اضافے کا سبب بنتے ہیں۔

یوں ہم دیکھتے ہیں کہ بنیادی طور پر بیوی ایک مفید گھریلو جانور بن کر رہ جاتی ہے۔ اُس کے جنسی وظیفے کو ثانوی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے۔ تہذیب وتمدن کے اس مرحلے پر مرد کے لئے بیوی کو طلاق دینا آسان ہو جاتا ہے۔ البتہ اُسے اس امر پر پابند کیا جاسکتا ہے کہ وہ بیوی کا لایا ہوا جہیز بھی طلاق کے وقت اُسے واپس کرے۔ تاہم بیوی کو عموماً یہ اجازت نہیں دی جاتی کہ وہ اپنے شوہر کو طلاق دے دے۔

اکثر نیم مہذب معاشروں میں بدکاری کے بارے میں رویہ اسی نقطہ نظر سے پیدا ہوتا ہے۔ تہذیب کی بہت سی پست سطح پر بسا اوقات بدکاری کو برداشت کرلیا جاتا ہے، مثلاً ہمیں بتایا گیا ہے کہ جب کبھی سامون لوگ سفر پر جایا کرتے تھے تو وہ توقع رکھتے تھے کہ ان کی غیر حاضری میں ان کی بیویاں اور دوسرے مردوں سے جنسی تسکین حاصل کرتی رہیں گی۔ تاہم تہذیب کی اس سے قدرے بلند سطح پر عورتوں کو بدکاری کی اجازت نہیں دی جاتی اور اس کی سزا موت یا بہت ہی سخت سزائیں دی جاتی ہیں۔ میرے عنفوان شباب میں منگو پارک کا بیان کردہ ممبو جمبو کا قصہ بہت مشہور تھا۔ تاہم حال ہی میں مجھے یہ جان کر دکھ ہوا کہ نک چڑھے امریکی جمبو کو کانگو کا ایک دیوتا خیال کرتے ہیں۔ اصل میں وہ دیوتا تھا اور نہ ہی اُس کا تعلق کانگو سے تھا۔ وہ تو بس جھوٹ موٹ کا بھوت تھا جو اپر نا بحر کے لوگوں نے اپنی بدکار عورتوں کو ڈرانے کے لئے تخلیق کیا تھا۔ منگو پارک کے بیان کردہ قصے

میں مذہب کے منبع سے متعلق والیٹر کے نقطہ نظر کی اس قدر واضح جھلک ملتی ہے کہ ان جدید ماہرین بشریات نے اس قصے کو دبانے کی کوشش کی ہے، جو وحشیوں کے اعمال میں معقول قسم کی بدمعاشی کا کوئی عنصر قبول نہیں کر سکتے۔ کسی دوسرے کی بیوی کے ساتھ بدکاری کرنے والے کو وہاں بلا شبہ مجرم گردانا جاتا تھا۔ لیکن کسی دوشیزہ کے ساتھ منہ کالا کرنے والے کو کوئی الزام نہ دیا جاتا تھا، بشرطیکہ اس فعل سے اُس لڑکی کی شادی کے نقطہ نظر سے قدر و قیمت کم نہ ہو۔

عیسائیت کی آمد نے اس صورت حال کو بدل دیا۔ اُس نے شادی میں مذہب کا کردار بڑھا دیا اور شادی کے قانون کی خلاف ورزی جائیداد کے بجائے ٹابو (تحریم) کی بنیاد پر قابل سزا قرار پائی۔ اس میں شبہ نہیں کہ مذہب نے بھی کسی دوسرے شخص کی بیوی کے ساتھ مباشرت کو اُس شخص کے خلاف جرم قرار دیا۔ لیکن اُس نے یہ تعلیم بھی دی کہ بیوی کے سوا کسی اور عورت سے جنسی تعلق خدا کے خلاف جرم ہے۔ مذہب کے نزدیک یہ بہت بڑا جرم ہے۔ مسیحی چرچ نے اس کے لئے سخت سزائیں مقرر کیں۔ مردوں کے پاس طلاق دینے کا جو حق تھا، چرچ نے اُسے منسوخ کر دیا۔ شادی کو عمر بھر کا عہد و پیمان قرار دے دیا گیا۔

اس امر کا فیصلہ کرنا بہت دشوار ہے کہ اس تبدیلی سے انسانی مسرتوں میں اضافہ ہوا یا کمی ہوئی۔ کسانوں میں شادی شدہ عورتوں کی زندگی ہمیشہ ہی بہت سخت رہی ہے اور کم مہذب کسانوں میں ان عورتوں کی زندگی مجموعی طور پر سخت ترین ہوتی ہے۔ اکثر وحشی اقوام میں عورت پچیس برس کی عمر میں بوڑھی ہو جاتی ہے اور اُس میں دلکشی کی کوئی جھلک باقی نہیں رہتی۔ عورتوں کو گھریلو حیوان قرار دینے کا تصور مردوں کے لئے بلا شبہ بہت خوش گوار تھا، لیکن عورتوں کے لیے اس کا مطلب محنتوں اور مشقتوں کی سخت زندگی تھا۔ عیسائیت نے بعض حوالوں سے عورتوں کی حالت اور بھی ابتر بنا دی۔ خاص طور پر کھاتے پیتے طبقے کی عورتوں کی حالت خراب تر ہوگئی۔ تاہم عیسائیت نے مردوں کے ساتھ عورتوں کی دینی برابری کو تسلیم بھی کیا اور انہیں محض اپنے شوہروں کی جائیداد ماننے سے انکار کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اگر چہ کوئی عورت کسی اور مرد کے لئے اپنے شوہر کو چھوڑنے کا حق نہ رکھتی تھی، تاہم وہ مذہبی زندگی کے لیے شوہر کی تیاگ سکتی تھی۔

جب ہم آج کی دنیا پر نگاہ ڈالتے ہیں اور اپنے آپ سے سوال کرتے ہیں کہ

ازدواجی مسرتوں اور ازدواجی رنجشوں کے عمومی اسباب کون کون سے ہیں، تو کس قدر عجیب وغریب نتائج سامنے آتے ہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ زیادہ مہذب لوگوں کے لیے کسی ایک شریک حیات کے ساتھ زندگی بھر کی پرمسرت زندگی دشوار ہوتی ہے۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے تک آئرش کسانوں کی شادیاں ماں باپ طے کیا کرتے تھے۔ ان کو جاننے والے لوگوں کا کہنا تھا کہ ان کسانوں کی ازدواجی زندگیاں عموماً خوش گوار اور صالح تھیں۔ عام بات یہ ہے کہ جہاں لوگوں میں فرق کم ہوا وہاں ازدواجی زندگی بہتر ہوتی ہے۔ جب ایک مرد دوسرے مردوں سے بہت کم مختلف ہو اور کوئی عورت دوسری عورتوں سے ملتی جلتی ہو تو پھر اپنی ازدواجی زندگی سے غیر مطمئن رہنے اور اس بات کا افسوس کرنے کا کوئی خاص موقع نہیں ہوتا کہ شادی کسی اور سے کیوں نہیں ہوئی۔ اس کے برخلاف جہاں ذوق، خواہشوں اور دلچسپیوں میں بہت فرق ہو وہاں ایک خاص قسم کے شریک حیات کی امنگ پیدا ہوتی ہے اور جب مرضی کے فرد سے شادی نہ ہو تو ازدواجی بے اطمینانی پیدا ہو جاتی ہے۔ کلیسا کا معاملہ یہ ہے کہ وہ ازدواجی زندگی کو صرف جنس کے حوالے سے دیکھتا ہے۔ لہٰذا اُسے اس بے اطمینانی کا سبب سمجھ میں نہیں آتا اور وہ شادی کے ناقابل تنسیخ ہونے پر اصرار کرتا ہے اور اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتا ہے کہ مرضی کا شریک حیات نہ ملنے پر ازدواجی زندگی اکثر اوقات بہت کٹھن ہو جاتی ہے۔

اگر غیر شادی شدہ عورتوں کی تعداد زیادہ نہ ہو اور شادی شدہ مردوں کو معزز عورتوں سے میل جول کے سماجی مواقع حاصل نہ ہوں تو بھی ازدواجی زندگی کو پرسکون بنانے میں مدد مل سکتی ہے۔ بیوی کے علاوہ دوسری عورتوں کے ساتھ جنسی تعلقات کا امکان موجود نہ ہو تو ماسوائے نہایت بدکار مردوں کے اکثر مرد اس صورت حال سے سمجھوتہ کر لیں گے اور ان کی خانگی زندگی پُرمسرت ہو جائے گی۔ اس بات کا اطلاق بیویوں پر بھی ہوتا ہے بشرطیکہ وہ شادی سے زیادہ مسرت کی توقعات وابستہ نہ کریں تو ازدواجی زندگی زیادہ خوش گوار ہوسکتی ہے۔

اسی حوالے سے ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ سماجی رواج کا استقلال بھی ناخوش گوار ازدواجی زندگی کو روکنے میں مددگار ثابت ہوسکتا ہے۔ شادی کے بندھن کو اگر حتمی اور ناقابل تنسیخ تسلیم کرلیا جائے تو پھر تخیل کو اس کی حدود سے تجاوز کرنے کا محرک نہیں ملتا اور نہ

ہی یہ پچھتاوا پیدا ہوتا ہے کہ اگر شادی کسی اور جگہ ہوتی تو زیادہ خوشیاں نصیب ہوسکتی تھیں، جہاں کہیں اس قسم کی ذہنی کیفیت موجود ہو، وہاں گھریلو امن قائم رکھنے کے لئے بس یہ ضروری ہے کہ میاں بیوی دونوں میں سے کوئی بھی شائستہ کردار کے عمومی معیار سے نیچے نہ گرے۔

جدید دنیا کے مہذب لوگوں میں ازدواجی زندگی کو پُر مسرت بنانے والی ان شرائط میں ایک بھی نہیں پائی جاتی۔ اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ شادی کے پہلے چند برسوں کے بعد کم ہی لوگوں کو خوش باش ازدواجی زندگی نصیب ہوتی ہے۔ عدم مسرت کے بعض اسباب کا تعلق تہذیب سے ہے۔ تاہم بعض دیگر اسباب ایسے ہیں کہ اگر مرد اور عورتیں زیادہ مہذب ہوجائیں تو وہ اسباب بھی ختم ہوجائیں گے۔

آیئے ہم دوسری قسم کے اسباب سے آغاز کرتے ہیں۔ اس قسم کے اسباب میں سے اہم ترین بُری جنسی تعلیم ہے۔ کھاتے پیتے لوگوں میں اس قسم کی تعلیم کا رواج کسانوں سے کہیں زیادہ ہے۔ کسانوں کے بچے نوعمری ہی میں ان باتوں سے آگاہ ہوجاتے ہیں جن کو ہم زندگی کے حقائق کہتے ہیں۔ ان حقائق کا مشاہدہ نہ صرف انسانوں بلکہ حیوانوں میں بھی کرلیتے ہیں۔ اس طرح وہ جہالت اور تنگ مزاجی دونوں سے بچ بھی جاتے ہیں۔ دوسری طرف امیر گھرانوں کے بچوں کی تعلیم و تربیت میں بڑی احتیاط سے کام لیا جاتا ہے اور انہیں جنسی معاملات کے عملی علم سے محفوظ رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ جدید طرز کے والدین جو بچوں کو کتابیں پڑھاتے رہتے ہیں وہ بھی انہیں عملی قربت کا احساس حاصل کرنے نہیں دیتے جو کسان بچے نوعمری میں حاصل کرلیتے ہیں۔ مسیحی تعلیمات کا تقاضا یہ ہے کہ مرد اور عورت پہلے سے کوئی جنسی تجربہ رکھے بغیر ازدواجی زندگی میں قدم رکھیں۔ اس قسم کی شادیوں کی بڑی تعداد میں نتائج خوش گوار نہیں ہوتے۔ انسانوں میں جنسی طرز عمل جبلی نہیں ہوتا۔ اس لئے غیر تجربہ کار دولہا اور دولہن پر، جو غالباً اس حقیقت سے آگاہ نہیں ہوتے، شرم اور بے چینی کا غلبہ ہوجاتا ہے۔ عورت اگر باعصمت ہو لیکن مرد نے طوائفوں کے وسیلے سے ان امور کا علم حاصل کرلیا ہو تو صورت حال قدرے بہتر ہوجاتی ہے۔ اکثر مردوں کو یہ احساس ہی نہیں ہوتا کہ شادی کے بعد عورت کو آمادہ کرنے کے لئے کوشش کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اسی طرح بہت سی عورتیں ہیں کہ جن کی

پرورش اچھی ہوتی ہے، لیکن وہ نہیں جانتیں کہ سرد مہر اور جسمانی طور پر لاتعلق رہ کر وہ اپنی ازدواجی زندگی کو کس قدر نقصان پہنچاتی ہیں۔

بہتر جنسی تعلیم کے ذریعے ان خامیوں کو دور کیا جاسکتا ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ اس معاملے میں آج کے نوجوان اپنے باپ دادا کی نسل سے بہتر ہیں۔ گزرے ہوئے زمانے میں عام طور پر عورتیں سمجھتی تھیں کہ چونکہ وہ جنس سے کم لطف حاصل کرتی ہیں اس لئے وہ اخلاقی لحاظ سے مردوں سے بہتر ہیں۔ اس رویے نے میاں بیوی کے مابین بے تکلفانہ رفاقت کو محال بنا رکھا تھا۔ بجائے خود بھی یہ تصور بلا جواز تھا، کیونکہ جنس سے لطف اندوز ہونے میں ناکامی پاکبازی کی علامت نہیں بلکہ کسی جسمانی یا نفسیاتی خامی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ یہ بات ویسے ہی ہے جیسے کوئی شخص خوراک سے لطف نہ اٹھا سکے۔ خیر، سو سال پہلے نفیس اور مہذب عورتوں سے یہ توقع بھی کی جاتی تھی کہ وہ کھانے پینے سے بھی لطف اندوز نہ ہوں گی۔

خوش گوار ازدواجی زندگی میں حائل ہونے والی دوسری نئی رکاوٹوں کو دور کرنا آسان نہیں ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ خوش باش مہذب مرد اور عورتیں ایک سے زیادہ افراد کے ساتھ جنسی تعلق رکھنے کا جبلی رجحان رکھتی ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ انہیں کسی کے ساتھ شدید قسم کی محبت ہو جائے اور چند برسوں تک وہ کسی اور کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھیں۔ لیکن جلد یا بدیر وہ ایک ہی فرد کے ساتھ جنسی رفاقت سے اکتا جاتے ہیں اور پرانا جوش و خروش بحال کرنے کی خاطر تاک جھانک شروع کر دیتے ہیں۔ بلاشبہ یہ ہوسکتا ہے کہ اخلاقی اصولوں اور ضابطوں کی خاطر اس تحریک پر قابو پالیا جائے، لیکن اُسے ختم نہیں کیا جاسکتا۔ عورتوں کی آزادی کے سبب میاں بیوی کو ایک دوسرے کے ساتھ جنسی بے وفائی کے مواقع پہلے کے مقابلے میں زیادہ دستیاب ہو گئے ہیں۔ موقع خیال کو جنم دیتا ہے اور خیال سے خواہش پیدا ہوتی ہے۔ جہاں مذہبی پابندیاں نہ ہوں وہاں خواہش سے عمل کی طرف راہ بن جاتی ہے۔

عورتوں کی آزادی نے کئی حوالوں سے شادی کے لیے مشکلات پیدا کر دی ہیں۔ پرانے وقتوں میں بیوی اپنے آپ کو شوہر کے تقاضوں کے مطابق ڈھال لیتی تھی، لیکن شوہر کو ضرورت نہ ہوتی تھی کہ وہ اپنے آپ کو بیوی کی خواہشوں کے مطابق ڈھالے۔

اب بہت سی عورتیں اپنی انفرادیت اور اپنے کیرئیر کو عزیز رکھتی ہیں۔ لہٰذا وہ ایک حد سے زیادہ اپنے آپ کو شوہر کی مرضی سے ہم آہنگ کرنے پر آمادہ نہیں ہوتیں۔ دوسری طرف بوسیدہ روایت کے دامن سے بندھے ہوئے بہت سے مرد اپنے آپ کو تبدیل کرنے پر تیار نہیں ہوتے۔ بے وفائی کے معاملے میں یہ مشکل خاص طور پر پیدا ہوتی ہے۔ ایام گزشتہ میں شوہر گاہے بگاہے جنسی بے وفائی کا ارتکاب کرتے تھے، لیکن عموماً بیویوں کو خبر نہ ہوتی تھی۔ خبر ہو بھی جاتی تو شوہر اعتراف گناہ کر لیتا اور بیوی کو یقین دلاتا کہ اُسے اپنے اس فعل پر شرمندگی ہوئی ہے اور وہ تائب ہو گیا ہے۔ اُس ماحول میں بیوی عام طور پر پاک باز ہوتی تھی۔ اگر ایسا نہ ہوتا اور شوہر کو بیوی کی کرتوتوں کا پتہ چل جاتا تو شادی کا بندھن ختم ہو جاتا۔ کئی جدید شادیوں میں میاں بیوی ایک دوسرے سے جنسی وفاداری کا مطالبہ نہیں کرتے لیکن رقابت کی جبلت ابھی تک قائم چلی آتی ہے۔ چنانچہ میاں بیوی میں ہنگامہ آرائی نہ ہو تو بھی یہ جبلت اُن میں گہری قربت کو نقصان پہنچاتی ہے۔

جدید ازدواجی زندگی میں ایک اور بھی دشواری موجود ہے جس کو خاص طور پر محبت کی قدر کا گہرا شعور رکھنے والے لوگ محسوس کرتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ محبت صرف اُس وقت پھل پھول سکتی ہے جب کہ وہ آزاد اور بے ساختہ ہو۔ جب اُسے فرض سمجھ لیا جائے تو وہ ختم ہونے لگتی ہے۔ جب یہ کہا جائے کہ فلاں فرد سے محبت کرنا آپ کا فرض ہے تو گویا اُس فرد سے یقینی نفرت کی بنیاد رکھ دی جاتی ہے۔ چونکہ ازدواجی زندگی محبت اور قانونی بندھن کا امتزاج ہوتی ہے لہٰذا اُس میں یہ دونوں باتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ شیلے نے اس صورت حال کو خوب بیان کیا ہے:

I never was attached to great sect
Whose doctrine is that each one should select
Out of the Crowd a mistress or a friend,
And all the rest, though wish and good, commend
To cold oblivion, though it is the code
Of modern morals, and the beaten road
Which those poor slaves weary footsteps tread
Who travel to their home among the dead
By the broad highway of the world, and so

With one chain'd friend, perhps a jealous foe,

The dreariest and the longest journey go.

اس بارے میں کوئی شبہ نہیں کہ اگر شادی محبت کی دوسری تمام راہیں مسدود کر دے تو اثر پذیری، ہمدردی اور بیش قدر انسانی رابطے بھی مسدود ہو جاتے ہیں۔ یہ طرز عمل اُس شئے کے لیے نقصان دہ ہے جو سب سے زیادہ آدرش پسند نقطہ نظر سے بجائے خود پسندیدہ ہے۔ علاوہ ازیں بندش اور جبری اخلاق کی دوسری تمام اقسام کی طرح یہ طرز عمل بھی انسانی زندگی کے بارے میں پولیس مین جیسے نقطہ نظر کو فروغ دیتا ہے۔ اس سے مراد وہ نقطہ نظر ہے جو ہمیشہ کسی نہ کسی امر سے روکنے کے مواقع کی تلاش میں رہتا ہے۔

ان اسباب کی بنا پر ازدواجی زندگی مشکلات کی گھر گئی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس سے کئی اسباب اچھی چیزوں سے منسلک ہیں لیکن شادی کو اگر خوشیوں کی راہ میں رکاوٹ نہیں بننا تو پھر ضروری ہے کہ اُس کا نئے انداز سے تصور کیا جائے۔ اس سلسلے میں ایک حل عموماً پیش کیا جاتا ہے اور امریکہ میں وسیع پیمانے پر اُسے بروئے کار بھی لایا گیا ہے۔ وہ حل طلاق کو آسان بنانا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ طلاق کے معاملے میں ہمارے قوانین سخت گیر ہیں اور یہ کہ طلاق کو زیادہ سہل ہونا چاہیے لیکن میرے نزدیک طلاق کے مسائل کا حل نہیں ہے۔ جہاں بچے نہ ہوں وہاں طلاق مسئلے کا صحیح حل ہو سکتی ہے۔ لیکن بچوں کی موجودگی میں شادی کے بندھن کا استحکام میرے نزدیک خاصا اہم معاملہ ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ اگر شادی باثمر ہو اور میاں بیوی دونوں معقول اور نفیس انسان ہوں تو پھر توقع یہ ہونی چاہیے کہ ان کے لئے شادی زندگی بھر کی رفاقت ثابت ہوگی۔ البتہ یہ توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ وہ جنسی طور پر بھی ایک دوسرے کے ہمیشہ وفادار رہیں گے اور ازدواجی بندھن سے باہر جنسی تعلقات نہیں رکھیں گے۔ اگر کوئی شادی جذباتی محبت سے شروع ہوتی ہے اور ایسے بچوں کو جنم دیتی ہے جن کی آرزو کی جاتی ہے اور جن سے محبت بھی کی جاتی ہے، تو پھر اُس شادی کو میاں بیوی کے درمیان ایسا گہرا رشتہ پیدا کرنا چاہیے جو جنسی خواہش میں کمی کے بعد بھی قائم رہے اور وہ دونوں اُس وقت بھی باہمی رفاقت کے دلدادہ رہیں جب انہیں یا ان میں سے کسی ایک کو کسی اور کسی کی جنسی خواہش محسوس ہونے لگے۔ شادی کی اس چاشنی میں رقابت نے زہر گھول رکھا ہے۔ بہر طور ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ اگرچہ رقابت ایک جبلی جذبہ ہے لیکن اُسے جائز اخلاقی غیظ وغضب کے اظہار کے

بجائے بُرا سمجھا جائے تو اُس پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ جو رفاقت برسوں سے قائم ہو اور جس نے زندگی کے طوفانوں کا مقابلہ کیا ہو، اُس میں ایسی وسعت اور گہرائی پیدا ہو جاتی ہے جو محبت کے ابتدائی ایام میں موجود نہیں ہوتی، حالانکہ یہ ابتدائی ایام بہت مسرت انگیز ہو سکتے ہیں۔ جس شخص کو ماضی اور یادوں کی اہمیت کا احساس ہو، وہ اس گہری رفاقت کو کسی نئی محبت کی خاطر آسانی سے ختم نہیں کر سکتا۔

اس ساری بحث سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ مہذب عورتوں اور مردوں کے لئے ازدواجی زندگی پُر مسرت ہو سکتی ہے، تاہم اس سلسلے میں انہیں کئی شرائط پوری کرنا ہوں گی۔ فریقین میں مساوات کا احساس ہونا ضروری ہے۔ دونوں کو ایک دوسرے کی آزادی میں دخل نہیں دینا چاہیے۔ دونوں میں مکمل جسمانی اور ذہنی قربت ہونی چاہیے۔ اسی طرح اقدار کے معیار کے معاملے میں بھی دونوں میں ایک خاص حد تک اتفاق ہونا چاہیے۔ (مثال کے طور پر یہ صورت حال پسندیدہ نہیں ہوگی کہ میاں بیوی میں سے ایک کے نزدیک صرف روپیہ پیسہ اہم ہو اور دوسرا صرف اچھے کاموں کو اہمیت دیتا ہو) یہ حالات پیدا ہو جائیں تو پھر میرے نزدیک شادی دو انسانوں کے مابین بہترین اور اہم ترین رشتہ بن سکتی ہے۔ اگر شادی اب تک اس قسم کا رشتہ نہیں بن سکی ہے تو اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ میاں بیوی اپنے آپ کو ایک دوسرے کا سنتری خیال کرتے ہیں۔ یاد رکھیے کہ شادی کے امکانات کی تکمیل صرف اُس وقت ممکن ہے جب میاں بیوی یہ جان لیں کہ قانون کے تقاضے چاہے کچھ ہوں، لیکن اپنی نجی زندگی میں انہیں لازماً آزاد ہونا چاہیے۔

رومانوی محبت

دنیائے قدیم اگرچہ ناگوار تھی، لیکن وحشیانہ نہ تھی۔ عیسائیت اور وحشیوں کی کامیابی سے البتہ زن ومرد کے تعلقات میں ایسی وحشت شامل ہوگئی جو کئی صدیوں سے قدیم دنیا میں معدوم تھی۔ یورپ میں تاریک صدیوں کے دوران زندگی کے جنسی پہلو کی تذلیل کے لئے مذہب اور بربریت میں ملاپ ہوگیا۔ ازدواجی زندگی میں عورتوں کے حقوق باقی نہ رہے۔ شادی کی حدود سے باہر چونکہ تمام تعلقات گناہ کی ذیل میں شامل تھے، لہٰذا غیر متمدن مرد کے فطری جذبوں کو دبانے میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہی۔ قرون وسطیٰ کی بداخلاقی عام تھی اور کراہت انگیز بھی۔ بشپ اپنی ہی بیٹیوں کے ساتھ گناہ کی زندگی کھلے عام بسر کرتے تھے جب کہ آرچ بشپ صاحبان کے منظورِ نظر مردوں کو ترقی کے وافر مواقع میسر تھے۔ مذہبی افراد کے تجرد کی زندگی گزارنے کا عقیدہ فروغ پذیر تھا، لیکن ان کا عملی چال چلن بالکل مختلف تھا۔ آخر کار تیرہویں صدی کے اواخر میں ہی پادریوں کو تجرد کی زندگی گزارنے پر مجبور کیا جاسکا تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ بعدازاں بھی عورتوں کے ساتھ اُن کے ناجائز تعلقات کا سلسلہ جاری رہا۔ تاہم وہ تعلقات کو کوئی حسن یا وقار عطا نہ کرسکے۔ سبب یہ تھا کہ وہ خود بھی ان رشتوں ناطوں کو غیر اخلاقی اور ناپاک خیال کرتے تھے۔ چرچ بھی جنس سے متعلق اپنے زاہدانہ نظریے کے سبب محبت کے تصور کو خوبصورت اور دلکش بنانے کے لئے کچھ نہ کرسکا۔ یہ کام دنیاداروں کو کرنا پڑا۔

یہ بات حیرت انگیز نہیں کہ اپنے عہد توڑنے اور ایسی زندگی اختیار کرنے کے بعد، جس کو وہ مسلسل گناہ کی زندگی خیال کرتے تھے، مذہبی افراد جلد ہی عام دنیاداروں کی سطح سے بھی بہت نیچے گر گئے۔ ہمیں ۲۳ ویں پوپ جان پال کی سیاہ کاری جیسی اکا دکا مثالوں پر زیادہ زور دینے کی ضرورت نہیں۔ اس پوپ کو بدکاری اور دوسرے کئی جرائم کے علاوہ محرمات سے جنسی تعلقات کے الزام میں بھی سزا دی گئی تھی۔ کنٹر بری میں سینٹ ہوگسٹائن کے منتخب ایبٹ کا قصہ بھی مشہور ہے جس کے بارے میں تفتیش کرنے پر ۱۱۷۱ء

میں معلوم ہوا تھا کہ صرف ایک گاؤں میں اُس کے سترہ ناجائز بچے تھے۔ سپین میں سینٹ پیلاؤ کے ایک ایبٹ کے بارے میں ۱۱۳۰ء میں ثابت ہوا تھا کہ اُس کی کم از کم ستر داشتائیں ہیں۔ ۱۲۷۴ء میں لشیر کے بشپ ہنری سوم کو ۶۵ ناجائز بچوں کا باپ ہونے کے جرم میں معزول کیا گیا تھا۔

خیر، یہ محض چند مثالیں ہیں ان پر زور نہ دیا جائے تو بھی ان کونسلوں اور کلیسائی مصنفوں کی فراہم کردہ شہادتوں کو نظر انداز کرنا دشوار ہے جنہوں نے ان سے کہیں زیادہ مکروہ برائیوں کی نشاندہی کی ہے۔ یہ دیکھا گیا کہ جب پادری بیویاں حاصل کرتے تو یہ علم کہ یہ رشتے ناطے غیر قانونی ہیں، اُن کی جنسی وفاداری کے لئے خاص طور پر تباہ کن ثابت ہوتا۔ ان لوگوں میں ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کا رواج بھی عام تھا۔ قرون وسطیٰ کے مصنفین نے راہبہ عورتوں کی ایسی خانقاہوں کا چرچا کیا ہے جن کی کیفیت قحبہ خانوں جیسی تھی۔ ان کی چار دیواریوں میں وسیع پیمانے پر اطفال کشی ہوتی۔ پادریوں میں محرمات سے جنسی تعلقات کا رواج بھی عام تھا۔ اسی لئے بار بار اس قسم کے احکام جاری کئے جاتے تھے کہ پادری لوگوں کو اپنی ماؤں اور بہنوں کے ساتھ رہنے کی اجازت نہ دی جائے۔ یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ عیسائیت نے دنیا سے غیر فطری جنسی تعلقات کو ختم کرنے میں نمایاں حصہ لیا تھا، لیکن مسیحی خانقاہوں میں یہ روگ ابھی تک موجود تھا۔

قرون وسطیٰ کے سارے زمانے میں چرچ کی یونانی رومی روایات اور اشرافیہ کی ٹیوٹونک روایات کے درمیان بے حد انوکھی تقسیم برقرار رہی۔ تہذیب وتمدن میں ان دونوں قسم کی روایات نے اپنا اپنا کردار ادا کیا ہے لیکن یہ کردار ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھا۔ چرچ نے علوم وفنون، فلسفہ، شرعی قانون اور مسیحی دنیا کی وحدت کو فروغ دیا۔ دوسری طرف عام لوگوں نے کامن لاء، سیکولر حکومت کی مختلف صورتوں، جواں مردی، شاعری اور رومانس کے فروغ میں حصہ لیا۔ یہاں ہمیں جس معاملے سے زیادہ دلچسپی ہے، وہ رومانوی محبت ہے۔

یہ کہنا بجا نہ ہوگا کہ قرون وسطیٰ سے پہلے رومانوی محبت معروف نہ تھی۔ تاہم یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ اسے جذبے کی وسیع پیمانے پر تسلیم شدہ صورت کا درجہ قرون وسطیٰ ہی میں حاصل ہوا۔ رومانوی محبت کا جوہر یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ اس کے نزدیک محبوب

شئے نہایت ہی گراں قدر ہوتی ہے اور اُس کا حصول بہت دشوار ہوتا ہے۔ لہٰذا محبوب کا دل جیتنے کے لئے اُسے گیت سنگیت، ضیافتوں، ہتھیاروں یا محبوب کا دل خوش کرنے والے دوسرے طریقوں کو بروائے کار لا کر بے حد تگ و دو کرنا پڑتی ہے۔ ہزاروں قسم کے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ محبوب کی قدر و قیمت کا تصور اُس کے حصول میں پیش آنے والی مشکلات کے نفسیاتی اثر سے پیدا ہوتا ہے۔ گویا میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اگر کسی مرد کو اپنے محبوب کو حاصل کرنے کی راہ میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی تو پھر محبوب کے لئے اُس کا احساس رومانوی محبت کی صورت اختیار نہیں کرتا۔

قرون وسطیٰ کے دوران جس قسم کی رومانوی محبت منظر عام پر آئی، اُس کا رخ پہلے پہل ایسی عورتوں کی طرف نہ تھا جن سے محبت کرنے والے جائز یا ناجائز جنسی تعلقات قائم کر سکتے۔ اصل میں اس محبت کا رخ اعلیٰ ترین طبقے کی خواتین کی طرف تھا جن کو اخلاق و رواج کی ناقابل عبور رکاوٹیں ان کے چاہنے والوں سے دور رکھتی تھیں۔ چرچ نے مردوں کے دل میں اس خیال کو راسخ کر دیا تھا کہ وہ جنسی اعتبار سے ناپاک ہیں۔ لہٰذا وہ کسی ایسی عورت کے بارے میں کوئی شاعرانہ احساس نہ رکھ سکتے تھے جو ان کے لئے قابل حصول ہو۔ گویا محبت بھی وہی خوبصورت ہو سکتی تھی جو افلاطونی قسم کی ہو۔ آج کے انسان کے لئے قرون وسطیٰ کے شاعر عاشقوں کی نفسیات کو اپنے تخیل میں سمجھنا بہت مشکل ہے۔ وہ عاشق محبوب کے وصال کی کسی آرزو کے بغیر ہی محبت کا دم بھرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ آج کے انسان کے لئے یہ بڑی عجیب و غریب بات ہے اور وہ یہ خیال کرنے لگتا ہے کہ ان عاشقوں کی محبت محض ایک ادبی رواج کی حیثیت رکھتی تھی۔ بلا شبہ بسا اوقات معاملہ یہی تھا اور اس میں بھی شبہ نہیں کہ اُس محبت کے ادبی اظہار پر رواجوں کا پہرہ تھا لیکن بیٹرس کے لئے دانتے کی محبت، جیسا کہ وہ Vita Nuova میں سامنے آتی ہے، محض رواجی ہرگز نہ تھی۔ اس کے برخلاف مجھے یوں کہنا چاہیے کہ یہ ایک ایسے شدید جذبے سے عبارت ہے جس سے اکثر جدید لوگ ناآشنا ہیں۔ قرون وسطیٰ کی زیادہ عالی ظرف روحیں دنیاوی زندگی کو اچھا نہ سمجھتی تھیں۔ ان کے نزدیک ہماری انسانی جبلتیں بے ایمانی اور گناہ آدم کی پیداوار تھیں۔ وہ لوگ جسم اور اُس کے تقاضوں سے نفرت کرتے تھے۔ اُن کے خیال میں خالص مسرت تمام جنسی آلاشوں سے پاک وجد آفریں دھیان سے ہی حاصل ہو سکتی تھی۔

اس نظریے نے محبت کے ضمن میں اُس رویے کو جنم دیا جو ہمیں دانتے کے ہاں دکھائی دیتا ہے۔ کسی خاتون سے گہری محبت اور اُس کا احترام کرنے والا کوئی شخص اُس سے جنسی اختلاط کا خیال بھی دل میں لانا محال سمجھے گا، کیونکہ اُس کے نزدیک جنسی تعلق برائی کے زمرے میں داخل ہے۔ یوں اُس کی محبت شاعرانہ اور تخیلاتی صورتیں اختیار کرے گی اور فطری طور پر علامتوں سے بھرپور ہوگی۔ جیسا کہ ہم محبت کی شاعری کے بتدریج ارتقا میں محسوس کر سکتے ہیں، ادب پر اس قسم کی محبت کے اثرات قابل تعریف تھے۔ یہ شاعری شہنشاہ فریڈرک دوم کے دربار سے شروع ہوئی اور نشاۃ ثانیہ کے زمانے میں عروج پر پہنچی تھی۔

قرون وسطیٰ کے آخری ادوار میں محبت کی ایک بہترین تشریح میرے خیال میں ۱۹۲۴ء میں شائع ہونے والی ہری زنگا کی کتاب The waning of Middle Ages میں ملتی ہے۔

وہ لکھتا ہے کہ ''پروینس کے مطرب آوارہ گرد شاعروں نے جب بارہویں صدی میں بھوکی خواہش کو محبت کے شاعرانہ تصور میں مرکزی جگہ دی تو تہذیب کی تاریخ میں ایک اہم موڑ پیدا ہوگیا۔ دنیائے قدیم میں بھی محبت کے دکھوں کے گیت گائے جاتے تھے۔لیکن تب انہیں مسرتوں کی آرزو یا اُس کی المناک ناکامی سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ جب کہ نیا شاعرانہ آدرش شہوانی محبت سے تمام رابطوں کو ختم کیے بغیر ہر قسم کی اخلاقی امنگوں کو خود میں شامل رکھنے کے قابل تھا۔اس طرح محبت ایک ایسا میدان بن گئی جہاں اخلاقی اور ثقافتی کمال فروغ پاتے تھے۔ اپنی محبت کے سبب شائستہ عاشق پاکیزہ تھا اور نیک اطوار بھی۔ تیرہویں صدی کے آخر تک روحانی عنصر کا غلبہ بڑھتا چلا گیا۔ دانتے کے زمانے تک یہ تصور عام تھا کہ محبت پاک بازی اور راست بازی کا درس دیتی ہے۔ یہاں معاملہ ایک انتہا تک پہنچ گیا تھا۔ یوں ردعمل کا سلسلہ شروع ہوا اور پہل اطالوی شاعری نے کی۔اس شاعری میں شہوانی جذبے کے قدرے حقیقت پسندانہ اظہار کا رواج بتدریج ہونے لگا۔ محبت پر رومانیت کے جو خول چڑھائے گئے تھے، وہ ایک ایک کر کے اترنے لگے۔ یہاں تک کہ جلد ہی پاک محبت کا مصنوعی نظام ہمیشہ کے لئے رد کر دیا گیا۔

خیر، فرانس اور برگنڈی میں صورت حال اٹلی سے مختلف تھی۔ وجہ یہ ہے کہ

فرانس کے بالائی طبقے کی محبت کا تعلق اگر چہ سورمائی محبت سے تھا، لیکن وہ نا آسودہ رہنے پر اصرار نہ کرتی تھی۔ اصل میں ہم اُسے چرچ کی تعلیمات کے خلاف ردعمل قرار دیتے ہوئے یہ کہہ سکتے ہیں کہ اُس نے زندگی میں محبت کے جائز مقام سے متعلق پرانے خیالات کورواج دیا۔ وہ غیر معمولی ناشائستگی کا دور تھا۔ پھر بھی عاشقوں سے توقع کی جاتی تھی کہ وہ مذہبی مفہوم میں پاک باز نہ ہوتے ہوئے بھی مہذب، شریف النفس اور دلیر ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے خیالات صرف اشرافیہ کے لئے تھے، کیونکہ انہیں نہ صرف فرصت تھی بلکہ کلیسائی پابندیوں سے ایک حدتک آزادی بھی حاصل تھی۔ کھیلوں کے مقابلوں میں محبت کے محرکات بالکل واضح تھے اوور اس لئے چرچ کو ان سے خاص نفرت تھی۔ لیکن چرچ انہیں ختم کرنے میں بے بس تھا۔ اسی طرح چرچ سورمائی محبت کے نظام کو ختم نہ کرسکتا تھا۔ آج کے جمہوری زمانے میں ہم مختلف ادوار میں اشرافی طبقوں کی طرف سے دنیا پر کئے جانے والے احسانات کو عموماً فراموش کر دیتے ہیں۔ یہ بالکل یقینی ہے کہ اگر محبت کے احیا کے معاملے میں اشرافی سورماؤں کی محبتوں نے راہ ہموار نہ کی ہوتی تو نشاۃ ثانیہ میں اس قدر کامیابی حاصل نہ ہوتی۔

نشاۃ ثانیہ کے زمانے میں پیگن ازم کے خلاف ردعمل کے نتیجے میں محبت کا افلاطونی انداز پھیکا پڑ گیا، البتہ وہ شاعرانہ ضرور رہی۔ پھر بھی قرون وسطی کی روایت کا تھوڑا بہت اثر باقی رہا۔ قرون وسطے کی روایات ہمیں ڈان کی ہوتے اور اس کی ولسینیا میں نظر آتی ہیں۔ اس اثر کو سڈنی کی کتاب اسٹروفل اینڈ سٹیلا میں واضح طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے اسی طرح شیکسپیئر کے بعض سانیٹ بھی اس سے متاثر تھے۔ تاہم مجموعی طور پر نشاۃ ثانیہ کی رومانوی شاعری خوش باش اور براہ راست ہے۔ چنانچہ الزبتھ عہد کا ایک شاعر کہتا ہے:

Do not mock me in thy bed while these cold nights

freeze me dead.

ہمیں مان لینا چاہیے کہ یہ جذبہ واضح ہے اور براہ راست بھی۔ اسے کسی طور افلاطونی نہیں سمجھا جاسکتا۔ البتہ نشاۃ ثانیہ نے شاعری کو کورٹ شپ کے طور پر بروئے کار لانے کا سلیقہ قرون وسطٰی سے سیکھ لیا تھا۔ یہ عجیب بات ہے کہ اگر چہ قرون وسطٰی سے پہلے محبت کی بہت سی شاعری لکھی گئی تھی لیکن اُس کا بہت ہی معمولی حصہ کورٹ شپ کا براہ

راست حصہ تھا۔ ایسی چینی شاعری ہمیں ملتی ہے جو اپنے عاشق سے جدا ہو جانے والی خاتون کے دکھ کو پیش کرتی ہے۔ اسی طرح صوفیانہ ہندوستانی شاعری بھی ہے جس میں روح کو دلہن کے روپ میں پیش کیا جاتا تھا جو اپنے دولہا کی آمد کی منتظر ہے۔ دولہا خدا کی نمائندگی کرتا تھا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ مردوں کو اپنی محبوب عورتیں اس قدر آسانی سے حاصل ہو جایا کرتی تھیں کہ گیت سنگیت کے ذریعے ان کی توجہ حاصل کرنے اور انہیں خود سپردگی پر مائل کرنے کی ضرورت کم ہی پڑتی تھی۔ فنون کے نقطہ نظر سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ محبوباؤں کی سہل دستیابی افسوسناک ہی ہے۔ پسندیدہ بات یہی ہے کہ اُن کا ملنا محال نہ ہو، مگر آسان بھی نہ ہو۔ نشاۃ ثانیہ کے بعد سے اس قسم کی صورت حال عام طور پر موجود رہی ہے۔ اس راہ میں جو رکاوٹیں ہیں وہ کچھ تو خارجی ہیں اور کچھ باطنی۔ یہ دوسری قسم کی رکاوٹیں روایتی اخلاقی تعلیم کی بنا پر ضمیر کی خلش سے جنم لیتی ہیں۔

رومانوی محبت اپنے عروج پر رومانوی تحریک پر پہنچی۔ شیلے کو شاید ہم اس کا بڑا داعی قرار دے سکتے ہیں۔ جب شیلے محبت کا اسیر ہوا تو ایسے نازک احساسات اور وجدانی خیالات میں ان نتائج کو پیدا کرنے والا جذبہ اچھا ہے۔ اُسے محبت کو قابو میں رکھنے کا کوئی جواز دکھائی نہ دیتا تھا۔ خیر، جہاں تک اُس کے استدلال کا تعلق ہے، وہ فضول سی نفسیات پر مبنی ہے۔ خواہشوں کی راہ میں پیش آنے والی رکاٹوں نے اُسے شاعری لکھنے پر اکسایا تھا۔ شیلے میں پائی جانے والی رومانوی محبت ایک غیر مستحکم توازن کی کیفیت پر مبنی تھی۔ اس کیفیت کی نوعیت یہ ہے کہ اُس میں روایتی قسم کی رکاوٹیں اگرچہ موجود تھیں لیکن وہ ناقابل عبور نہ تھیں۔ رکاوٹیں اگر ناقابل عبور ہوتیں یا ان کا وجود ہی نہ ہوتا تو پھر رومانوی محبت پروان نہ چڑھ سکتی تھی۔ ان دونوں میں سے ایک انتہا کی مثال ہمیں چینی معاشرے میں ملتی ہے۔ چین کے روایتی معاشرے میں کوئی مرد اپنی بیوی کے سوا زندگی بھر کسی عزت دار خاتون سے نہیں مل سکتا تھا۔ اگر وہ اپنی بیوی سے مطمئن نہ ہوتا تو پھر اُسے چکلے کا رخ کرنا پڑتا تھا۔ چین کے پرانے معاشرے میں شادی بھی اس طرح ہوتی تھی کہ دلہن کا انتخاب دلہا کے عزیز واقارب کرتے تھے اور غالباً اسے شادی کے دن سے پہلے اپنی ہونے والی دلہن کو ایک نظر دیکھنے کا موقع بھی نصیب نہ ہوتا تھا۔ اس صورت حال کا نتیجہ یہ تھا کہ اُس کے تمام جنسی رشتے رومانوی مفہوم میں محبت سے عاری تھے اُسے اپنی محبوبہ کو حاصل کرنے

کی اُس جد و جہد سے نہیں گزرنا پڑتا تھا جو محبت کی شاعری کو جنم دیتی ہے۔ اس کے برعکس کامل آزادی کی صورت حال میں محبت کی عظیم شاعری لکھنے کے قابل کسی شخص کو محض اُس کی مردانہ کشش کے ذریعے عورتوں کے معاملے میں اس قدر کامیابی حاصل ہوسکتی ہے کہ اُسے اپنی بہترین تخیلاتی صلاحیتیں بروئے کار لانے کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ یوں ہم دیکھتے ہیں کہ محبت کی شاعری کا دارو مدار رواج اور آزادی کے درمیان ایک مخصوص نازک توازن پر ہے۔ جہاں کہیں کسی سمت میں بھی یہ توازن درہم برہم ہو جائے وہاں بہترین قسم کی محبت کی شاعری کا امکان ختم ہو جاتا ہے۔

خیر، محبت کی شاعری محبت کا واحد مقصد ہرگز نہیں ہے۔ رومانوی محبت ایسی صورتوں میں بھی پروان چڑھ سکتی ہے جہاں فن کارانہ اظہار کی ضرورت پیدا نہیں ہوتی۔ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ رومانوی محبت زندگی کی بہترین مسرتوں کا منبع ہے۔ جذبہ، تخیل اور پیار کی شدت سے ایک دوسرے کو چاہنے والے مرد اور عورت کے رشتے میں کوئی ایسی شئے ہے جس کی قدر و قیمت ہمارے اندازوں سے باہر ہے اور جس سے محروم رہنا بڑی بدقسمتی کی بات ہے۔ میرے خیال میں ہر سماجی نظام کو اس عظیم مسرت کے حصول کے مواقع فراہم کرنے چاہئیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ محبت زندگی کا بڑا مقصد بننے کے بجائے اُس کا محض ایک جزو ہو۔

نئے زمانوں میں، یوں کہہ لیجئے کہ انقلاب فرانس کے بعد سے اس خیال کو تقویت ملتی رہی ہے کہ شادی کو رومانوی محبت کا ثمر ہونا چاہیے۔ اکثر جدید لوگ اور خاص طور پر انگریزی بولنے والی دنیا کے لوگ اس خیال کو بلا چون و چرا قبول کئے ہوئے ہیں۔ انہیں کوئی خبر ہی نہیں کہ ابھی کچھ ہی عرصہ پہلے تک اسے ایک بڑا انقلابی قدم سمجھا جاتا تھا۔ سوڈیڑھ سو سال پہلے کے ناولوں اور ڈراموں میں نئی نسل کی اس ''بغاوت'' کا بہت چرچا ہوتا تھا کہ وہ والدین کی طے کردہ روایتی طرز کی شادی کے بجائے شادی کے اس نئے انداز کو اختیار کرنا چاہتے تھے۔ خیر، ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ اس نئے انداز سے اتنے ہی اچھے نتائج سامنے آئے ہیں جتنے اس کی ابتدا کرنے والوں کے پیش نظر تھے۔ مسز میلا پروپ نے اس سلسلے میں ایک اصول وضع کر رکھا ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ ازدواجی زندگی میں محبت اور بے زاری دونوں ہی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوتی ہیں، اس لئے بہتر ہے کہ آغاز

کسی قدر بے زاری سے کیا جائے۔

سیدھی سی بات یہ ہے کہ جب رومانوی محبت کے زیر اثر اور ایک دوسرے کے بارے میں جنسی علم کے بغیر لوگ شادی رچاتے ہیں تو ان میں سے ہر کوئی دوسرے کو ماورائی خوبیوں کا مالک سمجھتا ہے۔ اُس کی توقع ہوتی ہے کہ شادی خوشیوں بھرے طویل خواب کی مانند ہوگی۔ یہ معاملہ خاص طور پر ان عورتوں کے ساتھ پیش آتا ہے جن کی پرورش جہالت اور سخت احتیاط کے ماحول میں ہوتی ہے۔ یوں وہ جنسی بھوک اور رفاقت میں فرق کرنے کے قابل نہیں رہتیں۔ امریکہ میں جہاں شادی کے رومانوی تصور پر زیادہ زور دیا گیا ہے اور جہاں قانون اور رسم و رواج دونوں کی بنیاد کنواری بوڑھیوں کے سپنوں پر رکھی گئی ہے، نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں طلاق کا عام چلن ہوگیا ہے اور خوش باش ازدواجی زندگی خواب و خیال ہوگئی ہے۔

شادی محض دو افراد کی باہمی رفاقت سے لطف اندوز ہونے کا نام نہیں یہ اس سے زیادہ سنجیدہ معاملہ ہے۔ یہ ایک ادارہ ہے۔ شادی چونکہ بچوں کو جنم دیتی ہے، اس لئے وہ کافی سماجی اہمیت رکھتی ہے۔ اس کی اہمیت میاں اور بیوی کے ذاتی احساسات سے کہیں بڑھ کر ہے۔ یہ اچھی بات ہوسکتی ہے اور میرے خیال میں تو واقعی اچھی بات ہے کہ رومانوی محبت شادی کا محرک بنے۔ تاہم اس امر کو خوب سمجھ لینا چاہیے کہ جس قسم کی محبت ازدواجی زندگی کو خوش گوار رکھتی ہے اور شادی کے سماجی مقصد کی تکمیل کرتی ہے، وہ رومانوی محبت نہیں بلکہ .... محبت آفرین اور حقیقت پسندانہ محبت ہے۔ رومانوی محبت میں محبوب کو اُس کے حقیقی روپ میں نہیں دیکھا جاتا، کیونکہ جذبوں کی دھند اُس کے گرد چھائی رہتی ہے۔ بلاشبہ بعض عورتیں ایسی ہیں جو خاص قسم کے شوہر ملنے پر شادی کے بعد بھی اپنے گرد اس ہالے کو برقرار رکھ سکتی ہیں۔ لیکن یہ اُس صورت میں ممکن ہے کہ کوئی عورت اپنے شوہر کے ساتھ حقیقی قربت نہ رکھے اور اپنے حقیقی خیالات اور احساسات کو اس سے چھپائے رکھے اور ایک حد تک اپنے جسم کو بھی شوہر سے دور رکھے لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ اس قسم کی چالبازادائیں شادی کے بہترین امکانات کی تکمیل نہیں ہونے دیتیں۔ ان امکانات کی تکمیل کے لئے کسی ہیر پھیر کے بغیر محبت پر رفاقتیں درکار ہوتی ہیں۔

شاید یہ بھی ہے کہ رومانوی محبت کو شادی کے لئے ناگزیر قرار دینے میں ایک انارکی کا پہلو بھی شامل ہے۔ سینٹ پال کے نقطہ نظر کی طرح، ہم ایک مخالف مفہوم میں کہہ سکتے ہیں کہ اس قسم کی محبت میں یہ بات نظر انداز کر دی جاتی ہے کہ شادی کو اہمیت بچے عطا کرتے ہیں۔ بچوں کا مسئلہ نہ ہوتا تو پھر جنس سے متعلقہ کسی ادارے کی ضرورت بھی نہ ہوتی۔ جونہی بچے پیدا ہوتے ہیں، میاں بیوی دونوں یہ محسوس کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ ایک دوسرے کے بارے میں اُن کے احساسات پہلے کی طرح اہم ترین نہیں رہے۔

عورتوں کی آزادی

جنسی اخلاق آج کل جس تبدیلی کے دور سے گزر رہے ہیں اس تبدیلی کے دو بڑے عوامل ہیں۔ ان میں سے ایک مانع حمل دواؤں کی ایجاد ہے اور دوسرا عورتوں کی آزادی۔ یہاں ہم اس دوسرے عامل کو موضوع بحث بنائیں گے۔

عورتوں کی آزادی جمہوری تحریک کا حصہ ہے، اس کا آغاز انقلاب فرانس سے ہوا جس نے وراثت کے قوانین میں لڑکیوں کے حق میں تبدیلیاں پیدا کی تھیں۔ ۱۷۹۲ء میں شائع ہونے والی میری ولسٹون کی کتاب Vindication of the Rights of woman اُن خیالات کا ثمر تھی جنھوں نے ایک طرف تو انقلاب فرانس کو جنم دیا اور دوسری طرف وہ اس انقلاب کے نتیجے میں نمایاں ہوئے۔ اس کے زمانے سے مردوں کے ساتھ عورتوں کی برابری کا دعویٰ نہ صرف مسلسل کیا جارہا ہے بلکہ اُس کی شدت بڑھتی جارہی ہے اور کامیابی میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ جان سٹورٹ مل کر Subjection of women بہت مرعوب کرنے والی مدلل کتاب ہے جس نے مل کی بعد کی نسل کے غور وفکر کرنے والے افراد پر گہرا اثر ڈالا تھا۔

میرے ماں باپ دونوں مل کر پیروکار تھے۔ میری والدہ ۱۸۶۰ء کے عشرے میں عورتوں کو ووٹ کا حق دلوانے کے لیے تقریریں کیا کرتی تھیں۔ عورتوں کی تحریک سے انہیں اس قدر لگاؤ تھا کہ میری پیدائش کے وقت بھی انہوں نے پہلی ڈاکٹر خاتون، ڈاکٹر گیرٹ اینڈرسن، کی خدمات حاصل کیں۔ حالانکہ اُس وقت ڈاکٹر صاحبہ کوالیفائیڈ میڈیکل پریکٹشنز نہ تھیں، بلکہ صرف سند یافتہ دایہ تھیں۔ اُس ابتدائی ایام میں عورتوں کی تحریک بالائی اور متوسط طبقوں تک محدود تھی، لہٰذا زیادہ سیاسی قوت کی حامل نہ تھی۔ اُس زمانے میں مسٹر فیتھ فل بیگ ہر سال برطانوی پارلیمنٹ میں عورتوں کو ووٹ کا حق دینے سے متعلق بل پیش کیا کرتے تھے اور مسٹر سٹرینج ویز پگ اُس کی تائید کیا کرتے تھے۔ تاہم اس بل کے پاس ہونے اور قانون بننے کا کوئی امکان نہ تھا۔

خیر، اُس زمانے کے درمیانے طبقے سے تعلق رکھنے والے عورتوں کے حامیوں کو ۱۸۸۲ء شادی شدہ خواتین کے پراپرٹی ایکٹ کی منظوری کی صورت میں اپنے دائرے میں ایک بڑی کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ اس قانون کے بننے سے پہلے شادی شدہ عورت کی تمام جائیداد اُس کے شوہر کے کنٹرول میں ہوتی تھی۔ اس قانون کے بعد کی سیاسی صورت حال کے حوالے سے عورتوں کی تحریک کی تاریخ کوئی پرانی بات نہیں ہے۔ سب لوگ اُس سے آگاہ ہیں اور یہاں اُسے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ البتہ یہ امر قابل ذکر ہے کہ اکثر مہذب ملکوں میں عورتوں کو جس تیزی سے سیاسی حقوق حاصل ہوئے، اُس کی ماضی میں کوئی مثال نہیں ملتی، حالانکہ اس تبدیلی کے لیے نقطہ نظر میں بڑے پیمانے پر تغیر و تبدل درکار تھا۔ شاید ہم غلامی کے خاتمے کا حوالہ دے سکتے ہیں لیکن یہ یاد رکھنا ہوگا کہ اول تو جدید زمانے میں یورپی ملکوں میں غلامی کا رواج نہیں تھا اور دوسرے یہ کہ غلامی کے معاملے میں زن و مرد کے تعلق جیسا کوئی جذباتی عنصر شامل نہ تھا۔

عورتوں کی تحریک کی تیزی سے کامیابی کے میرے خیال میں دو قسم کے اسباب ہیں۔ ایک طرف تو جمہوری نظریے کا براہ راست اثر تھا، جس نے عورتوں کے مطالبات کو ناجائز قرار دینا محال بنا دیا۔ دوسری طرف یہ حقیقت تھی کہ ایسی عورتوں کی تعداد مسلسل بڑھتی جا رہی تھی جو گھر سے باہر اپنی روزی خود کماتی تھیں اور روزمرہ کی آسائشوں کے لئے اپنے اپنے باپوں یا شوہروں کی محتاج نہ تھیں۔ جنگ کے زمانے میں اس صورت حال کو اور بھی فروغ حاصل ہوا، کیونکہ اُس زمانے میں مردوں کے بہت سے کام عورتوں کے سپرد کرنے پڑتے تھے۔ عورتوں کو ووٹ کا حق دینے کے مطالبے پر جنگ سے پہلے جو اعتراضات کئے جاتے تھے، اُن میں سے ایک یہ تھا کہ عورتیں جنگ کے اہل نہیں ہوتیں اور نہ ہی وہ جنگی کوششوں میں شریک ہوسکتی ہیں۔ ایام جنگ میں عورتوں کی کارکردگی کے بعد یہ اعتراض خود بخود ختم ہوگیا اور جنگ کی تباہ کاریوں میں شریک ہونے کے باعث عورتوں کو ووٹ کا حق دے دیا گیا۔ عورتوں کی تحریک شروع کرنے والے خیال پرست سمجھتے تھے کہ عورتیں سیاست کا اخلاقی معیار بلند کریں گی۔ ظاہر ہے انہیں اس سے مایوسی ہوئی ہوگی لیکن لگتا ہے کہ خیال پرستوں کا مقدر ہی یہ ہے کہ جس شئے کے لئے وہ جدوجہد کرتے ہیں وہ انہیں ملتی ہے تو ایسی صورت میں کہ اُن کے خوابوں کے شیش محل چکنا

چور کر دیتی ہے۔

خیر، عورتوں کے حقوق کی اس اساس ایسے کسی عقیدے پر نہ تھی کہ وہ اخلاقی یا کسی اور حوالے سے مرجوں سے بہتر ہیں۔ یہ اساس بس یہ تھی کہ عورتیں بھی انسان ہیں یا پھر یوں کہیے کہ اس کی اساس جمہوریت کے عمومی اصول پر تھی۔ تاہم اس قسم کے دوسرے معاملات کی طرح یہاں بھی یہ ہوا کہ جب خواتین نے اپنے حقوق کا مطالبہ کیا تو ان کے حامیوں نے یہ دعویٰ شروع کر دیا کہ خواتین خاص خوبیوں کی حامل ہوتی ہیں اور یہ کہ ان خوبیوں کا تعلق اخلاقیات سے ہے۔

بہرحال عورتوں کی سیاسی آزادی کا ہمارے موضوع سے تعلق بالواسطہ ہی ہے۔ میری زیادہ دلچسپی ان کی سماجی آزادی سے ہے۔ ماضی میں عورتوں کی پاکدامنی کی حفاظت ان کو الگ تھلگ رکھ کر کی جاتی تھی۔ مشرق کے بعض حصوں میں ابھی تک یہی رواج ہے۔ اس طرح کوشش یہ کی جاتی تھی کہ انہیں گناہ کا کوئی موقع حاصل نہ ہو سکے۔ گناہ اور بدی کے خلاف مدافعت کے لئے انہیں باطنی طور پر مضبوط کرنے کی کوئی کوشش نہ کی جاتی تھی۔ مغرب میں اس طریقہ کار پر کبھی یکسوئی سے عمل نہ کیا گیا تھا۔ تاہم معزز خواتین کو ناجائز جنسی تعلقات سے ڈرنے کی تربیت بچپن ہی سے دی جاتی تھی۔ جب تعلیم کے یہ طریق ہائے کار زیادہ سے زیادہ پختہ ہوتے گئے تو بیرونی رکاوٹوں کو کم کیا جانے لگا۔ بیرونی رکاوٹوں کو کم کرنے کے حامیوں کو یقین تھا کہ اس معاملے میں داخلی رکاوٹیں کافی ہوں گی۔ مثال کے طور پر اتالیقہ (گورنس) کو غیر ضروری سمجھا جانے لگا، کیونکہ اگر کسی اچھی لڑکی کی مناسب تعلیم و تربیت ہوتی ہے تو مواقع میسر آنے پر بھی وہ نوجوانوں کے دام میں نہ آئے گی۔

میرے ایام شباب میں معزز خواتین عام طور پر یہ سمجھتی تھیں کہ عورتوں کی بھاری اکثریت کے لئے جنسی اختلاط ناخوش گوار ہوتا ہے اور یہ کہ اسے محض شادی کے بندھنوں کے سبب قبول کیا جاتا ہے۔ اس نقطہ نظر کے نتیجے میں وہ اپنی بیٹیوں کو زیادہ آزادی دینے کا خطرہ مول لینے پر تیار تھیں۔ اس کے نتائج توقع سے کسی قدر مختلف ثابت ہوئے اور یہ فرق شادی شدہ اور کنوری دونوں قسم کی عورتوں کے معاملے میں سامنے آیا ہے۔ وکٹورین عہد کی عورتیں ذہنی بندی خانے کی زندگی بسر کرتی تھیں۔ آج کی اکثر عورتوں کی کیفیت بھی یہی

ہے یہ جبیل چونکہ تحت الشعور میں دبی ہوئی خواہشوں سے وجود میں آتی ہے اس لئے شعور کو اس کا علم نہ تھا۔ ہمارے عہد کی نوجوان لڑکیوں نے اس جبیل اور دبی ہوئی خواہشوں کے خلاف بغاوت کی ہے۔ یوں شعور کی سطح پر وہ جبلی خواہشیں پھر سے نمایاں ہوگئی ہیں جو مصنوعی شرم وحیا کے پہاڑوں تلے دبی ہوئی تھیں۔ اس سے نہ صرف کسی ایک ملک یا طبقے بلکہ تمام مہذب ملکوں اور طبقوں کی جنسی اخلاقیات پر گہرے انقلابی اثرات مرتب ہوئے ہیں۔

ابتدا ہی سے عورتوں اور مردوں کے درمیان برابری کے مطالبے نے نہ صرف سیاسی معاملات بلکہ جنسی اخلاقیات سے بھی تعلق رکھا ہوا تھا۔ میری ولسٹون کرافٹ کا رویہ مکمل طور پر جدید تھا۔ تاہم بعد کی نسل میں خواتین کے حقوق کے لئے کام کرنے والے اس معاملے میں اُس کے نقش قدم پر نہیں چلے۔ میری ولسٹون کرافٹ کے برعکس وہ سخت قسم کے اخلاق پرست تھے۔ وہ چاہتے یہ تھے کہ مردوں کے پاؤں میں بھی وہ بیڑیاں ڈال دی جائیں جو اب تک صرف عورتوں کے پاؤں میں رہی تھیں۔ بہرحال ۱۹۱۴ء کے بعد سے زیادہ منطق بگھارے بغیر نوجوان عورتیں مختلف رویہ اختیار کرتی رہی ہیں۔ بلاشبہ اس نئے رویے کا بڑا سبب پہلی جنگ عظیم کا جوشیلا ولولہ تھا۔ تاہم جنگ نہ ہوتی تو بھی وہ زیادہ تاخیر کے بغیر پیدا ہونا ہی تھا۔ ماضی میں عورتوں کی پاکبازی کے دو بڑے عوامل دوزخ کی آگ کا خوف اور حمل ٹھہرنے کا ڈر تھا۔ مذہب کے زوال سے پہلا حرف ختم ہوگیا جب کہ دوسرے ڈر کو مانع حمل دواؤں نے دور کردیا۔ رسم ورواج کی قوت اور ذہنی جمود کی بدولت روایتی اخلاقیات مانع حمل دواؤں نے دور کردیا۔ رسم ورواج کی قوت اور ذہنی جمود کی بدولت روایتی اخلاقیات تھوڑے بہت وقت تک برقرار رہنے میں کامیاب ہوگئی۔ تاہم جنگ کے دھماکے نے اُس کی بوسیدہ دیواریں مسمار کردیں۔ آج کی عورتوں کے حقوق کے علمبردار نصف صدی پہلے کے علمبرداروں کی طرح مردوں کے ''گناہوں'' کو کم کرنے کے بارے میں پُرجوش نہیں ہیں۔ اس کے بجائے وہ یہ کہتے ہیں کہ جو کچھ مردوں کے لئے جائز ہے اُسے عورتوں کے لئے بھی روا ہونا چاہیے۔ ان کے پیش رو اخلاقی غلامی میں برابری تلاش کرتے تھے۔ جب کہ یہ خود اخلاقی آزادی میں برابری کے متلاشی ہیں۔

فی الحال یہ ساری تحریک ایک ابتدائی مرحلے میں ہے اور یہ کہنا ممکن نہیں کہ بالآخر وہ کیا صورت اختیار کرے گی۔ اس کے حامی اور پیروکار زیادہ تر نوجوان ہیں۔ بااثر اور

اہم افراد میں سے بہت کم ان کے حامی ہیں۔ اقتدار کے ان مالکوں کے علم میں جب کبھی متعلقہ حقائق آتے ہیں تو پولیس، قانون، مذہبی علما اور خود ان نوجوانوں کے والدین ان کے خلاف ہو جاتے ہیں۔ تاہم عام طور پر یہ نوجوان اس قدر نیک دل ہیں کہ وہ ان لوگوں سے حقائق پوشیدہ رکھتے ہیں جن کو ان حقائق کا علم ہونے پر دکھ پہنچ سکتا ہے۔ جسٹس لنڈز سے جسے ان حقائق کا چرچا کرنے والے مصنفین کو بزرگ نوجوانوں کی توہین کرنے والا خیال کرتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ نوجوان اس توہین سے بے خبر ہی رہتے ہیں۔

بہرحال اس قسم کی صورت حال غیر مستحکم ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ دو امکانات میں سے پہلے کس کی تکمیل ہو گی۔ یعنی آیا بزرگوں کو حقائق کا پتہ چل جائے گا اور وہ نوجوانوں کو ان کی نئی ملنے والی آزادی سے محروم کرنے پر تل جائیں گے، یا یہ ہو گا کہ وقت کے ساتھ ساتھ یہ نوجوان معاشرے میں اہم اور محترم مقامات حاصل کر لیں گے اور اس نئی اخلاقیات کو اتھارٹی کی تائید دلا دیں گے۔ یہ فرض کیا جا سکتا ہے کہ بعض ملکوں میں پہلی قسم کی اور دوسرے ملکوں میں دوسری قسم کی صورت حال سامنے آئے گی۔ مثال کے طور پر اٹلی میں دوسرے تمام امور کی طرح بداخلاقی کے خاتمے کو بھی حکومت نے اپنی ذمہ داریوں میں شامل کر رکھا ہے۔ لہٰذا وہاں پاکبازی کی بحالی کے لئے شدید کوشش جاری ہے۔ روس میں صورت حال اس کے بالکل برعکس ہے۔ وہاں کی حکومت نئی اخلاقیات کی خود حامی ہے۔ جرمنی کے پروٹسٹنٹ علاقوں میں آزادی کی فتح کی توقع کی جا سکتی ہے، جب کہ کیتھولک علاقوں میں معاملہ مشکوک ہے۔ فرانس اپنے قدیم رواج سے باہر شاید ہی قدم رکھے گا جس میں بداخلاقی کی بعض صورتوں کو برداشت کیا جاتا ہے، لیکن ان سے آگے جانے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ البتہ میں اس بارے میں کوئی پیش گوئی نہیں کر سکتا کہ برطانیہ اور امریکہ میں کیا ہو گا۔

آیئے، اب ہم ایک لمحہ توقف کر کے عورتوں اور مردوں کے درمیان برابری کے مطالبے سے پیدا ہونے والے منطقی نتائج پر ایک نظر ڈالیں۔ نظری طور پر نہ سہی، لیکن عملی طور پر صورت حال یہ ہے کہ زمانہ قدیم ہی سے مردوں کو ناجائز جنسی تعلقات کی آزادی حاصل ہے۔ مرد سے یہ توقع نہیں کی جاتی کہ وہ شادی کے موقع پر کنوارا ہو گا۔ بلکہ شادی کے بعد بھی اگر بیوی اور ہمسایوں کو خبر نہ ہو تو ناجائز جنسی تعلقات کو خطرناک نہیں سمجھا جاتا۔ اس

نظام کو عصمت فروشی نے برقرار رکھا ہے۔ جدید انسان کے لئے عصمت فروشی کے ادارے کا دفاع کرنا مشکل ہے، یہ بہت کم لوگ ہی یہ رائے دیں گے کہ مرد عصمت فروشوں کا ایک طبقہ بھی تیار کیا جائے تا کہ جو عورتیں اپنے شوہروں کی طرح، پاکبازی کا فریب کارانہ لبادہ اوڑھے رکھنا چاہتی ہیں، اُن کی تسکین کا سامان مہیا کیا جاسکے۔

اس کے باوجود یہ بات یقینی ہے کہ چونکہ آج کل شادیاں عموماً تاخیر سے ہوتی ہیں اس لئے ایسے مرد کم ہی ہوں گے جو اپنے طبقے کی کسی عورت کے ساتھ گھر بسانے تک پارسا رہیں۔ اب اگر غیر شادی شدہ مرد پارسا نہیں رہ سکتے تو پھر مساوی حقوق کی بنیاد پر عورتیں بھی دعویٰ کریں گی کہ انہیں شادی سے پہلے سات پردوں کے پیچھے چُھپ کر رہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اخلاق پرستوں کے لئے یہ صورت حال بلاشبہ افسوسناک ہوگی۔ روایتی اخلاق پرست اگر سوچنے کی زحمت گوارا کریں تو اس نتیجے تک پہنچے بغیر نہ رہیں گے کہ ہمارے اخلاقی معیار دہرے ہیں، یعنی یہ سمجھا جاتا ہے کہ جنسی پاکیزگی مردوں کے مقابلے میں عورتوں کے لئے زیادہ ضروری ہے۔ یہاں یہ دلیل دی جاسکتی ہے کہ روایتی اخلاقیات مردوں سے بھی پاکبازی کا مطالبہ کرتی ہے۔ تاہم اس کا سادہ سا جواب یہ ہے کہ مردوں کو یہ مطالبہ قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اُن کے لئے چھپ کر گناہ کرنا آسان ہے۔

اس طرح روایتی اخلاق پرست اپنی مرضی کے خلاف یہ ماننے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ عورتوں اور مردوں کے درمیان برابری نہیں ہے، بلکہ وہ یہ بھی اقرار کرتا ہے کہ نوجوانوں کے لئے بہتر یہ ہے کہ وہ اپنے طبقے کی کسی لڑکی کے بجائے طوائفوں کے ساتھ جنسی تعلق قائم کریں، حالانکہ اگر وہ اپنے طبقے کی لڑکیوں کے ساتھ جنسی ربط رکھیں تو یہ ربط نہ صرف روپے پیسے کی لالچ سے محفوظ ہوگا بلکہ زیادہ خوش گوار اور مسرت انگیز بھی ہوسکتا ہے۔ تاہم اخلاقی معلم اُس اخلاقی نظام کی وکالت کرنے کے مضمرات پر غور نہیں کرتے جس کے بارے میں انہیں معلوم ہو کہ اُس پر عمل نہ کیا جائے گا۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جب تک وہ عصمت فروشی کی وکالت نہ کریں۔ تب تک وہ اس حقیقت کے ذمہ دار نہیں کہ عصمت فروشی اُن کی تعلیمات کا ناگزیر نتیجہ ہے۔ خیر، یہ بات اس جانے پہچانے امر واقعہ کی ایک اور مثال ہے کہ ہمارے زمانے کے پیشہ ور معلمین اخلاق اوسط درجے کی ذہانت سے بھی محروم ہیں۔

مندرجہ بالا حالات کی روشنی میں ہم دیکھتے ہیں کہ معاشی اسباب کی بنا پر مرد جلد

گھر بسانے کے قابل نہیں ہوتے۔ دوسری طرف بہت سی عورتیں شادی سے محروم ہی رہ جاتی ہیں۔ اس لئے عورتوں اور مردوں کے درمیان مساوات کا تقاضا یہ ہے کہ نسوانی پاکبازی کے روایتی معیاروں میں لچک پیدا کی جائے۔ مردوں کو اگر شادی سے پہلے کھل کر کھیلنے کے مواقع میسر ہیں تو پھر عورتوں کو بھی اس قسم کی آزادی ملنی چاہیے۔ کئی معاشرے ایسے ہیں جن میں عورتوں کی تعداد مردوں سے زیادہ ہے اس طرح محض تعداد کے سبب کئی عورتیں شادی سے محروم رہ جاتی ہیں۔ ایسی عورتوں کو جنسی مسرت سے محروم رکھنا پرلے درجے کی ناانصافی ہے۔ یہ بجا ہے کہ عورتوں کی تحریک کے بانیوں نے اس قسم کے مضمرات پر غور نہ کیا تھا، تاہم ان کے جدید پیروکاران کا واضح ادراک رکھتے ہیں اور جو کوئی ان نتائج کی مخالفت کرتا ہے وہ جنسی معاملے میں عورتوں کے ساتھ انصاف کے حق میں نہیں ہیں۔

اس ساری بحث سے ایک مسئلہ بہت ہی واضح صورت میں سامنے آتا ہے۔ اگر دوشیزاؤں سے پاک بازی اور بیویوں سے وفاداری کا تقاضا اب نہیں ہونا چاہیے تو پھر ضروری ہے کہ یا تو ہم خاندان کے تحفظ کے لئے نئے طریقے واضح کریں یا پھر اُس کے خاتمے کو قبول کرلیں۔ یہ تجویز کیا جاسکتا ہے کہ بچوں کی پیدائش کی اجازت صرف شادی کے بندھن کے اندر دی جائے اور شادی کے دائرے سے باہر جنسی اختلاط پر مانع حمل دواؤں کا استعمال لازم قرار دیا جائے۔ اس صورت میں شوہر اپنی بیویوں کے عاشقوں کو قبول کرنا ویسے ہی سیکھ سکتے ہیں جس طرح اہل مشرق نے ہیجڑوں کو قبول کر رکھا ہے۔ تاہم اس سارے خاکے میں ایک دشواری موجود ہے۔ وہ یہ ہے کہ یہاں ہم بیویوں کے سچے ہونے اور مانع حمل دواؤں کے موثر ہونے پر معقول حد سے زیادہ اعتماد کر رہے ہیں۔ ممکن ہے وقت کے ساتھ ساتھ یہ مشکل کم ہوتی چلی جائے۔ نئی اخلاقیات سے مطابقت رکھنے والی ایک اور متبادل صورت یہ ہوسکتی ہے کہ معاشرے میں باپ کو جو اہمیت حاصل ہے وہ ختم کردی جائے اور باپ کے فرائض ریاست کے سپرد کردیئے جائیں۔ ہاں کسی خاص صورت میں اگر کسی شخص کو یقین ہو کہ وہ فلاں بچے کا باپ ہے اور اُسے بچے سے لگاؤ بھی ہو تو اُسے رضاکارانہ طور پر ماں بچے کی مالی مدد کرنے کی اجازت دے دی جائے تاہم یہ کام وہ اپنے طور پر کرے اور قانون کے ذریعے اُس کو اس کام پر مجبور نہ کیا جائے۔ اس طرح تمام بچوں کی حالت وہی ہوگی جو آج کل ان ناجائز بچوں کی ہوتی ہے جن کے باپ کا کوئی

علم نہیں ہوتا۔ البتہ ریاست اس صورت حال کو معمول کے مطابق خیال کرے گی اور بچوں کی پرورش پر آج کے مقابلے میں زیادہ توجہ دے گی۔

اس کے برعکس اگر پرانے اخلاقی نظام کا احیا مقصود ہے تو اُس کے لئے بعض چیزوں کی ضرورت ہوگی۔ ان میں سے چند ایک پر پہلے بھی عمل ہوتا ہے لیکن تجربہ بتاتا ہے کہ محض وہ کافی نہیں ہے۔

روایتی اخلاق کے احیا کے لئے پہلی لازمی بات یہ ہے کہ لڑکیوں کی تعلیم ایسی ہو جو انہیں احمق، توہم پرست اور جاہل بنا سکے۔ یہ تقاضا ان سکولوں میں پہلے ہی پورا ہو رہا ہے جو مذہبی افراد اور اداروں کے کنٹرول میں ہیں۔ دوسری لازمی بات یہ ہے کہ جنسی موضوعات پر معلومات فراہم کرنے والی تمام کتابوں پر کڑی سنسر شپ عائد کی جائے۔ ہمارے ہاں یہ شرط بھی خاصے موثر انداز میں پوری ہو رہی ہے۔ اچھا ہمارے ہاں یہ دونوں شرائط پوری ہو رہی ہیں، لیکن روایتی اخلاق کا احیاء نہیں ہو رہا، تو صاف طور پر اس کا مطلب یہ ہے کہ دونوں کافی نہیں ہیں۔ اس کے لئے مزید اس بات کی ضرورت ہے کہ نوجوان عورتوں کو مردوں کے ساتھ میل جول کے تمام مواقع سے محروم کر دیا جائے۔ لڑکیوں کو گھر سے باہر محنت مزدوری اور کام کاج کے لئے نہ جانے دیا جائے۔ ماں یا خالہ کی رفاقت کے بغیر انہیں گھر سے قدم باہر نہ رکھنے دیا جائے۔ آیا کے بغیر تقاریب میں شرکت کی افسوسناک رسم ختم کر دی جائے۔ پچاس برس سے کم عمر کی کسی غیر شادی شدہ عورت کو موٹر کار رکھنے کی اجازت نہ دی جائے۔ زیادہ دانش مندی کا تقاضا تو یہ ہے کہ تمام غیر شادی شدہ عورتوں کا ہر مہینے طبی معائنہ کروایا جائے اور ان میں سے جو کنواری ثابت نہ ہوں انہیں اصلاحی قید خانے میں بند کر دیا جائے۔ مانع حمل دواؤں کا استعمال ممنوع قرار دیا جائے اور کنواری عورتوں کے ساتھ گفتگو میں جہنم کی آگ کو رکھا جائے اور اس کے بارے میں کسی بھی شبے کو غیر قانونی قرار دیا جائے۔

ان تمام اقدامات پر سو سال یا اُس سے بھی زیادہ عرصے تک سختی سے عمل کیا جائے تو پھر شاید بداخلاقی کے بڑھتے ہوئے طوفان کو کسی حد تک روکا جا سکے گا۔ تاہم میرے خیال میں بعض خرابیوں سے بچنے کے لئے یہ بھی مناسب ہوگا کہ تمام پولیس مین اور ڈاکٹروں کو مردانہ صفات سے محروم کر دیا جائے۔ غالباً اس پالیسی میں دانش مندی کا تقاضا

یہ ہے کہ ایک قدم اور آگے کی طرف اٹھایا جائے اور معلمین اخلاق کو یہ مشورہ دیا جائے کہ وہ تمام مردوں کو مردانہ صفات سے محروم کرنے کی حمایت کریں۔ اس سلسلے میں صرف مذہبی افراد سے ساتھ رعایت کی جاسکتی ہے، لیکن اخبارات میں ان کے جنسی کارنامے پڑھ کر خیال آتا ہے کہ یہ رعایت بھی حماقت ثابت ہوگی۔

یہ امر بالکل واضح ہے کہ ہم جو راہ بھی اختیار کریں اُس میں مشکلات اور اعتراضات ضرور سامنے آئیں گے۔ اگر ہم نئی اخلاقیات کو پھلنے پھولنے دیں تو لازمی طور پر وہ آگے کی طرف بڑھے گی اور ایسی مشکلات پیدا کرے گی جن کا ابھی کوئی اندازہ نہیں کیا جاسکا ہے۔ دوسری طرف اگر ہم دنیائے جدید میں ایسی پابندیاں نافذ کریں جو گئے گزرے زمانوں میں ممکن تھیں تو پھر ہمیں ایسے قواعد وضوابط کی سختی سے پابندی کروانی ہوگی جو محال ہیں اور جن کے خلاف انسانی فطرت جلد ہی سرکشی پر اتر آئے گی۔

یہ امر اس قدر واضح ہے کہ ہمیں تمام خطرات اور مشکلات کے باوجود دنیا کو آگے بڑھنے دینا چاہیے اور اُسے پیچھے کی طرف نہیں کھینچنا چاہیے۔ اس مقصد کے لئے ہمیں ایک حقیقی نئے اخلاق کی ضرورت ہوگی۔ اس سے میری مراد یہ ہے کہ زندگی میں فرائض اور ذمہ داریاں تو موجود ہی رہیں گی، البتہ ان کی نوعیت اور صورت ماضی میں طے پانے والی فرائض اور ذمے داریوں سے مختلف ہوسکتی ہے۔ ہمارے معلمین اخلاق جب تک ماضی کے گئے گزرے اخلاقی نظام کی طرف واپسی کے گن گانے مگن رہیں گے، تب تک وہ نئی آزادی کو اخلاقی انداز دینے یا اُس آزادی سے پیدا ہونے والے نئے فرائض کی نشاندہی کے لئے کچھ نہ کرسکیں گے۔ میرا نہیں خیال کہ نئے نظام کو انسانی خواہشوں اور ترنگوں کے آگے سر جھکا دینا چاہیے۔ تاہم میں یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ خواہشوں اور جذبوں کے آگے بند باندھنے کے مواقع اور اسباب اب وہ نہ ہوں گے جو ماضی میں ہوا کرتے تھے۔ سچی بات یہ ہے کہ جنسی اخلاق کے پورے مسئلے پر از سر نو غور وفکر کی ضرورت ہے۔

☆☆☆